اندھا کنواں
حسن

حسن ساہو

نام کتاب :- اندھا کنواں
نام مصنف :- حسن ساہو
ناشر :- دوران پبلیکیشنز، ریڈکراس روڈ، سری نگر، کشمیر
خطاط :- عبدالرشید ڈار
سرورق :- ریاض آرٹسٹ، دھلی
مطبع :- جے۔ کے۔ آفسیٹ، پرنٹرس، دہلی
سال اشاعت :- ۱۹۹۶ء
تعداد :- ایک ہزار
قیمت :- ایک سو روپے

میں جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی کا شکرگذار ہوں جس کے جزوی مالی تعاون سے اس کتاب کی طباعت مکمل ہوئی۔ کتاب میں ظاہر کی گئی آراء واقعات یا کرداروں سے مطابقت کے لیے کلچرل اکیڈیمی کسی طور ذمہ دار نہیں ہے۔

حسن ساہو سرینگر
الحسنات ہمدانیہ کالونی بمنہ سرینگر۔ ۱۹۰۰۱۰۔
۷ مارچ ۱۹۹۶ء

ملنے کا پتہ :-
۱۔ کلوداچ ہاوس، بمقابل ہنومان مندر، امیراکدل، سرینگر۔ ۱۹۰۰۰۱
۲۔ نغمہ بک سپلائی کمپنی، ۲۳۴۴ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

فہرست

انتساب

برادر عباس عراقی (مرحوم) کے نام

جو دنیاداری کے جھمیلوں سے بے نیاز دنیائے آب وگل میں ایک منفرد شخصیت کی زندگی گزار گئے۔ خدائے تعالیٰ اُن کی روح کو جوارِ رحمت میں جگہ بخشے ___ آمین

مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام میں سے کچھ اشعار قارئین کرام کی نذر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

— صور پھونکے گا، جہاں زیر و زبر ہو جائے گا
ایک سی ہو جائے گی بالا و پستی ایک دن

— گھڑیاں جو رنج کی ہیں وہ ہنس کر گزار دے
دل ایک ایسا اے مرے پروردگار دے

— اک عزم و حوصلہ ہو اور جوش و ولولہ ہو
مشکل نہیں ہے کوئی، جو نہ ہو جائے آسان

— میں خوددار بندہ ہوں واحد خدا کا
جو مارے، جلائے، کھلائے پلائے

— کیسے حسین وعدوں میں اُلجھا کے رکھ دیا
ظاہر ہے کوئی وعدہ نبھایا نہ جائے گا

— عشق کے دامن میں کیسے پھول ہیں
رنج و نفرت، ذلتیں اور حادثات

— آ گلے مل کر کدورت کو کریں گے دور ہم
آ چراغ دل جلا کر کچھ بڑھائیں نور ہم

— زیست اور غم کا عراقی ساتھ ہے
سر پہ لٹکی ہے سدا تلوارِ غم

(حسن ساہو)

پیش لفظ

سب سے پہلے عرض کرنا چاہوں گا کہ احقر کو ادیبوں کے گروہ میں شامل نہ کیا جائے۔ ایک معمولی اور غیر معروف کہانی کار ہوں اور سیدھی و عام فہم زبان کا سہارا لیے اپنے بکھرے و گھائل جذبات کے اظہار کی کوشش کیا کرتا ہوں۔

ویسے کاغذ داغدار کرنے کا شوق لڑکپن سے رہا ہے۔ ابتدائی دور میں "ششش و پنج کاشمیری" کے نام سے لکھتا رہا۔ اور اسی نام سے کچھ افسانے و دیگر سماجی یا سیاسی طرز کے مضامین ملک کے مختلف جریدوں کی زینت بن گئے۔

ادبی سفر میں کسی ایک کی دست گیری یا رہبری اختیار نہیں کی۔ بلکہ اکیلے ہی ادب کے اس لق و دق صحرا میں ٹھوکریں کھاتے، گرتے اور سنبھلتے آگے کی جانب بڑھتا گیا۔ اس اُمید کے ساتھ کہ کبھی نہ کبھی اُس منزل کی دہلیز کو چھونے میں کامیاب اُتروں گا۔ جہاں ادبی قدروں کا تول مول نہیں ہوتا۔ اور اخلاقی لوازمات کو پامال کرنے کی کوشش نہیں اپنائی جاتی ۔۔۔ گو اس اُمید کو دل میں بسائے ایک لمبا عرصہ گزرا۔ لیکن اب بھی دُور دُور تک مطلوبہ منزل کے نشان نظر نہیں آتے۔

نہ تو سنہری ٹھیکریوں سے کھیلنے کو ہی زندگی سمجھتا ہوں، اور نہ مر مر کے جیے جانے کو زیست مانتا ہوں۔

ادب برائے زندگی کا قائل ہوں۔

اس بات کا یقین ہے کہ ادب کے وسیلہ سے انسان کو انسان سے قریب تر لایا جا سکتا ہے۔ اور انسانیت کی راہ پر گامزن آدم زاد ایک دوسرے کے بیچ

و غم بانٹ سکتے ہیں۔

سماج میں پلنے والے گندے و پلید عناصر کو طشت از بام کرنے کی نیت سے مختلف موضوعات پر بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ شروع شروع میں اکثر ترقی پسند ادیبوں کی طرح میرے احساسات پر بھی روسی تخلیقات کا نمایاں اثر رہا۔ لیکن جلد ہی خالق کائنات کے پسندیدہ دین اسلام کے زرین اصول خاص کر رواداری و مساوات کی نسبت سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں پر حکمرانی کرنے میں کامیاب اترے عام راستوں سے بچ کر چلنے کی عادت میرے مزاج کا خاصہ بن گئی ہے اور اُسے ترک کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔

میری تحریروں میں بہت کچھ مواد ایسا ملے گا جو براہ راست اس ملک و ریاست کی ثقافت کی دین ہے ــــ آس پاس کی دنیا کے مسائل جس قدر پیچیدہ ہیں ان کا مجموعی احساس مجھے بھی ہے ــــ ان کربناک حالات میں مجبور انسانوں کے دلوں کی آوازیں میں نے سنی ہیں اور اُن میں موضوعات تلاش کیے ہیں۔

اس اصلیت کا بھی احساس ہے کہ ہم اکیسویں صدی کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اسی صدی میں جینا اور مرنا ہے اور اسی صدی میں بسی تلخی و خوشی میں جھانک کر حیات تلاش کرنی ہے ــــ اپنے ہی جیسے انسانوں سے وابستگی، اپنی ذات سے رابطہ اور سب سے بڑھ کر انسان اور خالق کے مابین پاک رشتے۔۔۔۔۔۔ یہ سب موضوع میرے افسانوں میں ملیں گے۔

مجھ میں بہت سی کمزوریاں بھی ہیں۔ سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ میں اپنے فن پر اتنی محنت و کاوش نہیں کرتا جو ضروری ہے۔ خوب پر راضی ہوتا ہوں اور کبھی بھی خوب تر کی جستجو نہیں کی ہے۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ جب تک کسی کہانی کا پس منظر سامنے نہ منڈلائے میں کچھ لکھ نہیں پاتا ــــ اور کبھی کبھار زندہ جاوید کردار مواد بکھرے دم توڑ جاتے ہیں اور میں دیکھتا رہ جاتا ہوں یعنی زمانے کی گردش کا ہدف بنے سارے کے سارے واقعات سپرد قلم کرنے سے رہ جاتا ہوں۔ پھر بھی یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ تحریر کے پس پردہ انسان

وانسانیت کی بقا کارفرما رہتی ہے۔

ایک سے دو بن جانے کے بعد جانے پہچانے نام "شش و پنج کاشمیری" کو کچھ احباب و کرم فرماؤں کے اصرار پر ترک کرکے "حسن ساہو" کے نام سے لکھنے لگا۔ نام بدلنے کے ساتھ ساتھ میرے ادبی ذوق میں ایک غیر معمولی ارتعاش سما گیا۔ یوں جانیے کہ دُنیا ہی بدل کے رہ گئی۔

سکوت کا عالم برسوں طاری رہا ــــ اپنے آس پاس کے ادبی ماحول کو میں نے بُری طرح خاموشی کے اتھاہ کھوہ میں مقید پایا۔

گھریلو ذمہ داریاں اعصاب پر سوار ہو کر مجھے زیر کرنے لگیں اور پھر ملازمت کے دوران بیس سال محکمہ برقیات سے وابستہ رہنے کے سبب فرصت کے لمحات جام شہادت نوش فرما گئے۔ یقین کیجیے اس لمبے چوڑے عرصہ میں دماغ کی حالت ایک ویران قبرستان سے کم نہ رہی۔ پھر بھی ناموافق حالات کے ہوتے ہوئے میں نے حوصلے کا دامن ہاتھوں سے نہیں چھوڑا اور اپنے ٹوٹے خیالات صفحہ قرطاس کے سپرد کرتا گیا... ــــ۔ "بھائی موہن یاور" نے اس ضمن میں میری جانب دست اعانت دراز کیے میرے دبے ہوئے ادبی ذوق کو پھر سے اُبھارنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کی تگ و دو کے باعث میرا پہلا افسانوی مجموعہ "پھول کا ماتم" معرض وجود میں آیا۔ پھر ایک عرصہ سکوت کے عالم میں گزارنے کے بعد دوسرا افسانوی مجموعہ "لیتی لیتی صحرا صحرا" پروفیسر محمد زمان آزردہ" کی ذاتی کوششوں کی وجہ سے چھپ گیا۔

ان دونوں مجموعوں کو خلاف اُمید بہت سے احباب و ادب نواز اصحاب نے سراہا۔ میری ہمت افزائی فرمائی ــــ اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی محنت کا صلہ مل گیا ــــ

اور بھی بہت سی شخصیتیں ہیں جن کی یادیں میرے حافظہ میں بحاطور پر موجود ہیں۔ اگر سب کا تذکرہ چھیڑ دوں تو ایک دفتر لگ جائے گا۔ لیکن ایک شخصیت کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا ــــ وہ میری بیوی "لاڈلی بیگم صاحبہ" ٹھہری۔ اس نے میری

زندگی کے حالات پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ انتہائی زود رنج، مغرور مزاج اور جلد باز واقع ہوئی ہے۔ دونوں کے مزاج میں تضاد واقع ہونے کے باعث ہم میں اکثر شکر رنجیاں پیدا ہو جاتیں۔ اور کبھی کبھار تو نوبت ازدواجی زندگی میں تلاطم بپا ہونے تک کو پہنچ جاتی تھی ـــــ لیکن مجھے یاد نہیں کہ معذرت میں پہل کون کرتا تھا۔ البتہ اتنا کہہ دوں کہ اشتراکِ عمل کی برقراری کا سہرا بسا اوقات بیگم کے سر رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ غلط صحبت اپنانے کے باعث میں کچھ غلط عادتیں اپنا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے شدید مالی نقصان بھی اُٹھانا پڑا۔ بیگم صاحبہ نے اپنی تندمزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ان عادتوں سے نجات دلادی۔ ناراض ہو کے اور ۔ ۔ ۔ ۔ وقت پر بات چیت کا سلسلہ منقطع کر کے اُس نے دراصل مجھے راہ راست پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔ واقعی اس نے بے نظیر ایثار سے کام لیا۔

ہم دونوں زندگی کی مسرّتوں سے کافی حد تک محروم ہو چکے ہیں۔ لیکن ہمارے حوصلے پست نہیں ہوئے اور باہمی جدوجہد ختم نہیں ہوئی۔ اس پرہنگم وافراتفری سے لبریز دور میں جن لوازمات نے مجھے حوصلہ اور تقویت بخشی، اُن میں بیگم کی معاملہ فہمی، اس کی مخلص بہن زاہدہ تقدیس فردوسی، جبل پور، کی وفا کیشی اور ماموں زاد برادر غلام حیدر خان کی رواداری پیش پیش رہی ہے۔

حساس دل پایا ہے۔ میں کسی ایک کو دکھی یا پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ دست رس میں ہوتا تو یقیناً عملی طور پر ہر ایک کا درد و دکھ بانٹنے کی کوشش کرتا۔ دراصل میری ذات بھی وقت کے بے رحم پھندوں میں مقید ہے کچھ کر نہیں پاتا ہوں.

گو دلی خواہش تھی کہ "اندھا کنواں" کے نام سے ایک ناول چھاپ دوں! مواد بھی جمع کیا تھا۔ لیکن سالہا سال گزرنے کے بعد اس مواد پر گرد کا لبادہ چڑھ گیا۔ اور پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ کساد بازاری کے دور میں جب کہ ادبی قدروں پر بھی جمود سا چھانے لگا ہے۔ قارئین کرام کے پاس وقت کی فراوانی کہاں کہ لمبی لمبی

کہانیاں ایک نشست میں پڑھ لیں اور پھر آج کل مختصر کہانیاں یا افسانچے تحریر کرنے کا
رواج پھیل گیا ہے۔ اس لیے ناول کو سکڑ سے سمیٹے افسانے کا روپ دیا ہے۔ اس مجموعے
میں سب کی سب کہانیاں حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہیں۔

آخر میں اس اصلیت کا بھی انکشاف کر دوں کہ کتابوں کی تیاری پر کافی
لاگت آ رہی ہے، کاغذ، سیاہی، کور، کتابت، چھپائی اور دوسرے سامان کی
گرانی حد سے بڑھ گئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت بہت کم لوگوں
میں رہ گئی ہے۔ کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں اتنا کہہ دوں کہ ہمارے ہاں مانگ کر
کتابیں پڑھنے کا بہت رواج ہے اور حیرت ہے کہ اس بُری روش کو عیب میں شمار
نہیں کیا جاتا۔ یہ صورت حال ایک المیہ سے کم نہیں!

اگر ہر ایک قاری اپنے ایک مہینے کے مصارف میں صرف ایک کتاب کی خرید
کا عہد کر لے تو بہت ہے تاکہ کم از کم مجھ جیسے درمیانی درجے کے کہانی کار کو حق تصنیف
کے طور پر کچھ معاوضہ حاصل ہو۔

اس تمہید کے ساتھ کہانیوں کا تیسرا مجموعہ "اندھا کنواں"
قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس اُمید کے ساتھ کہ ادب دوست حضرات
ان افسانوں کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کریں گے اور اپنی گراں قدر رائے سے احقر کو
مطلع فرمائیں گے۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اُردو میں ہفت روزہ "دوران"
سرینگر سے شائع کر کے صحافتی تقاضوں کی آبیاری کرنے کی سعی کی لیکن تھوڑے سے عرصے
میں اس اصلیت کا اندازہ ہوا ہے کہ اس کاروباری دور میں صحافتی قدروں کو بھی پامال
ہونا پڑ رہا ہے۔ دراصل گذشتہ چھ برسوں کے دوران "صحافت" کے پیشے کو بھی پلید کرنے
کی کوشش اپنائی گئی ہے۔ خیر حالیہ پر آشوب حالات سے سمجھوتہ نہ کر کے "دوران" بے باک
و شستہ صحافت کی ترجمانی کرنے میں پیش پیش ہے۔

حسن ساہو

المکان: ہدایہ کالونی بلبل — سرینگر ۱۹۰۰۱ کشمیر

وقت کا اسیر

اتفاق کی بات ہے کہ جب بھی میں نے اپنی کشتیِ حیات کو اداسی کے بحر بے کراں میں غوطہ زن پایا۔ اور جب بھی مصائب سے دوچار ہوا تو آگے بڑھ کر یار غار انور نے مجھے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ دراصل وہ سدا پریشانیوں میں میری ڈھارس بندھاتا رہا۔ ایسا نہ ہوتا تو نہ جانے کب کا فرار کا راستہ اپنا تے میں نے اس جہان کو الوداع کہہ چکنے کی بابت شد و مد کے ساتھ سوچا ہوتا۔ دراصل اگر دیکھا جائے تو انور میرے ہی وجود کا دوسرا روپ نظر آئے گا۔

لیکن کبھی کبھی میں جب اس کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس سے بے حد نفرت ہونے لگتی ہے۔ بارہا میرا جی چاہا کہ اس کے وجود کا گلا گھونٹ کے سکون حاصل کر سکوں لیکن میں کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ صرف سوچتا ہوں۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی میرا بوڑھا باپ مہلک بیماری کی زد میں آکر اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گیا۔ بدلے میں میرے کمزور کاندھوں پر دو جوان بہنوں اور بیمار ماں کا بوجھ ڈال گیا۔ ان دنوں میں خود تلاش روزگار کے سلسلے میں سڑکیں ناپتا تھا اور دفتروں کی خاک چھانتا تھا۔ بہنوں کی ابتر حالت اور ماں کی بیماری سے تنگ آکر میں نے چاہا کہ اس سماج کے خلاف علم بغاوت بلند کروں۔ لیکن بد حالی و بے بسی کا ہدف بنے، میں کچھ نہ کر پایا۔ ماں برابر خون تھوکنے لگی۔

جب میں ہر طرف سے مایوس ہوا تو لالچوک کے نکڑ پر انور سے ملاقات ہوئی۔

وہ اُداس اُداس تھا۔ اسی روز اس کی ماں نے پریشانیوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی لیکن وہ پھر بھی زندہ رہا۔ اپنی بہنوں کی خوشنودی کی خاطر وہ ماں کی دائمی جدائی ہنستے ہنستے برداشت کر گیا اور یہ کہہ کر کہ "ہر ڈراونی رات کے بعد نئی صبح مسکراتی ہے"۔ الور مجھ سے بچھڑ گیا۔ یہ سب دیکھ کر مجھ میں زندہ رہنے اور زندگی کرنے کی تمنا جاگ اُٹھی۔

بڑی تگ و دو اور کوششوں کے بعد مجھے ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازم ہونا نصیب ہوا۔ قلیل تنخواہ پر۔ وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ اور میں اپنے ساتھی الور کی یاد تک کو کسی حد تک فراموش کر گیا۔ دراصل پریشانیوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔

ماں کا خون تھوکنا بند نہیں ہوا۔ اس کی بیماری نے میری تنخواہ کو مہینے میں بیس دنوں سے زیادہ چلنے نہ دیا۔ آدھا پیٹ کھاتے اور بہنوں کو اسکول سے اُٹھانے کے عوض جو رقم بچی وہ ماں کی بیماری کے سبب ڈاکٹروں کے حصے میں آ گئی۔ البتہ نوشتۂ تقدیر کے آگے میری ایک نہ چلی۔ اور ایک رات سارا خون تھوک کے ماں نے بے حس جسم کو مٹی کی نذر کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ بھی مہینے کی پچیس تاریخ کو۔

ماں کی تجہیز و تکفین کے لیے میرے پاس کچھ نہ تھا۔ سب کا سب اثاثہ ختم ہوا تھا پریشانیوں نے ہر سو گھیر لیا۔ مایوسیوں کے اندھیرے مجھے نگلنے لگے۔ اُس وقت میرے دل میں خودکشی کرنے کا جذبہ اُبھر پڑا۔ لیکن عین وقت پر الور نے آگے بڑھ کر میری دست گیری کی۔

سپاہی اُسے پکڑ کے لے جا رہے تھے۔ اس نے کسی ایک کی جیب کاٹ لی تھی۔ الور رو رہا تھا۔ چلا رہا تھا کہ وہ چور نہیں۔ جیب کترا نہیں۔ اس کی جوان بہن کی لاش اس کے جھونپڑے میں پڑی ہے جس کے کفنانے اور دفنانے کا انتظام کرنے کی خاطر وہ جیب کاٹنے پر مجبور ہوا۔

پولیس نے ایک نہ سُنی۔ وہ اسے لے جا رہے تھے اور آدمیوں کی ایک خاصی بھیڑ اس کے ساتھ ساتھ پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ اس بھیڑ میں گھس کے میں نے دوسرے آدمی کا وزنی بٹوہ اُچک لیا اور اپنی ماں کے سکڑے سمٹے جسم کو مٹی کے نیچے

دبا دیا۔ ـــــــ انور سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ میری بڑی بہن نے ماں کی طرح خون تھوکنا شروع کیا۔ میں اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ اس پر طرہ یہ کہ ادارہ میں تخفیف کی ہوا چلنے لگی جس کی زد میں آتے مجھے دیگر کئی ساتھیوں سمیت بے روزگاری کا شکار ہونا پڑا۔ اداسی کا مجسمہ بنے میں اپنی زیست کو ختم کرنے کے منصوبے پر ایک بار پھر غور کرنے لگا۔

اب جینے کے لیے رہا ہی کیا تھا۔ اس دوران مجھے انور مل گیا۔

وہ جھیل ڈل کے کنارے ایک خوش پوش آدمی سے باتیں کر رہا تھا،

"صاحب! تیس روپے۔ صرف تیس روپے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دم خوب صورت اور جوان میری طرح" ـــــ صاحب مسکرا پڑے۔

"تیری طرح ۔ کیا تیری بہن ہے؟" انور کا چہرہ لٹک گیا۔

میں نے دیکھا کہ کچھ لمحوں بعد صاحب کا بٹوہ کھلا۔ دس دس کے تین نوٹ ہواؤں میں لہرائے اور آن واحد میں انور کے پھٹے کوٹ کی جیب میں چھپ گئے۔

اتنے میں مجھ سے نظریں ٹکرائیں اور کہہ گئے۔

"حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھو میرے دوست! ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دنیا والے تمہیں جینے نہیں دیں گے۔"

میں نے انور کی بات آن سنی کر دی اور سوچا کہ اس اندھیری رات کا سویرا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میری بہن نے خون تھوکنا بند نہیں کیا ـــــ وہ برابر خون تھوکتی رہی۔ اور میری زندگی عذاب مسلسل بن کر رہ گئی۔ وسیع و عریض دنیا سمٹ کر میرے لیے قید خانہ بن گئی۔ اور بدلتے بگڑتے حالات بیڑیوں کا روپ دھار گئے جن کا بوجھ برداشت کرنے کی سکت اب مجھ میں نہیں۔

یہ زمانہ مجھے جس ڈگر پہ لا کھڑا کر دینا چاہتا ہے۔ میں اس کے تصور سے گھبراتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں رہے سہے زندگی کے ایام جائز ڈھنگ سے گزار دوں

لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس دنیا تے آب و گل میں کون ہے جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کار نیک میں میرا ہاتھ بٹائے ۔ اب میری حالت اس ملاح سے کسی طرح کم نہیں جس کی کشتی منجدھار میں چھپی چٹانوں کی طرف رواں دواں ہو جہاں بربادیاں اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ اسے پاش پاش کرنے کے لیے کمربستہ کھڑی ہوں ۔

گو اب مجھے انور نہیں ملتا ۔ ایک مدت گزر گئی اُسے دیکھے ۔ نہ جانے اب وہ میرا رفیق کس حال میں ہے ۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ عیش و عشرت اور مسرت سے لبریز لمحات کو اپنی زندگی سے وابستہ کرنے کی تمنا میں انور نے اپنی ہستی کو داؤ پر لگا دیا ہو ۔ ویسے میں پُر اُمید ہوں کہ انور کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی روپ میں مجھے پھر ملے گا ۔

زندگی کا کرب

ڈاکٹر ارشد ایک کامیاب سرجن کی حیثیت سے شہر بھر میں مشہور ہو گئے ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں انہوں نے کچھ خطرناک قسم و پیچیدہ طرز کے آپریشن بھی نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیے ہیں۔

احمد بابا کو کینسر تھا۔ شہر کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اور ڈاکٹر ٹھاکر دھاری نے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ دہلی جانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر ارشد نے کامیابی کے ساتھ اس کا آپریشن کیا تھا۔

ڈاکٹر ارشد کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت۔ مرتبہ۔ عزت اور ساتھ میں آرام و آسائش کے تمام ذرائع مہیا تھے۔ لیکن اس کی اپنی زندگی خالی خالی سی لگ رہی تھی۔ وہ اپنی دنیا آباد نہ کر سکا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا کریں! خدائے برحق نے ارشد کو سب کچھ عطا کیا تھا۔ لیکن بدصورت چہرہ اس کی با توازن زلیست میں ایک ناسور کی طرح اس کی ہر بشاشت کو تہس نہس کرنے میں پیش پیش رہا۔

دراصل بچپن میں اس کا چہرہ ایک معمولی حادثہ میں جھلس گیا تھا اور پھر چیچک کے حملے نے اپنے نشان واضح انداز میں چھوڑے کہ چہرے کے بگاڑ نے بن میں

مزید اضافہ کر دیا تھا۔

ڈاکٹر ارشد کی اس ایک خامی نے اس کی لاتعداد اچھائیوں پر دبیز پردہ ڈال دیا تھا۔ انہیں اصلیت کا احساس بجا انداز میں ہو چکا تھا کہ ازدواجی رشتے کے لیے صرف ایک کامیاب ڈاکٹر ہونا تو سب کچھ نہیں۔ جب بھی وہ ایک سے دو بن جانے کی بابت سوچتے تو ان کا وجود تھرا اُٹھتا۔ ان کے دل کے زخمی تاروں پر ایک بھرپور چوٹ لگتی —— دیکھتے دیکھتے تار ٹوٹ کر بکھر جاتے اور سارا نغمہ سو جاتا —— خدا نے طبیعت بھی بخشی تھی تو بڑی حساس اور اس پر طرہ یہ کہ ڈاکٹر کا پیشہ اختیار کر لیا۔

خیر ڈاکٹر ارشد نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سمجھا دیا اور حالات سے سمجھوتہ کیے انہوں نے ازدواجی زندگی بسانے کی بابت سوچتے ہوئے خود کو اس قدر مصروف کر دیا کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوتے۔

اسی طرح کچھ مہینے گزر گئے اور ایک روز نئی مریضہ نسرین، بیڈ نمبر ۸ پر کراہ رہی تھی! ڈاکٹر ارشد اس پر جھکے ہوئے اس کا معائنہ کر رہے تھے۔ معائنہ کرتے ہوئے نسرین میں انہوں نے نئی بات پائی۔ وہ حیرت کی تصویر (بنے برابر) نسرین کو تکتے جا رہے تھے وارڈ کے دیگر مریضوں کا خیال بھی نہ رہا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" نسرین نے ایک روز نحیف آواز میں پوچھا۔

میں نے آج کچھ عجیب پن محسوس کیا ہے نسرین! —— یہ وارڈ، یہ ہسپتال ہی نہیں بلکہ سارا زمانہ مجھ سے نفرت کرتا ہے مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اکثر جب میں مریضوں کا معائنہ کرتا ہوں اُس وقت مریض یا تو مُنہ پھیر لیتے ہیں، یا منہ بنا کر اپنی نفرت کا برملا اظہار کرتے ہیں لیکن —— خلاف معمول تم نے نفرت کا ہلکا سا اظہار بھی نہیں کیا"

"آپ ڈاکٹر ہیں —— اور میں مریضہ —— ہم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ٹھہرا —— ڈاکٹر سے نفرت کرنے سے کیا حاصل ہو؟ اور پھر اُٹھتے اگر دل

سے پُرخلوص و انسیت کے پیکر ہوں ۔" نسرین نے پُر خلوص انداز میں کہا۔
ڈاکٹر ارشد کی آنکھیں چمک اُٹھیں ۔" لیکن، میرا یہ بھیانک چہرہ!
" تو کیا ہوا ۔۔۔ ؟ بدصورت آدمی نہیں ہوا کرتے ۔" نسرین برجستہ کہہ اُٹھی۔
" ڈاکٹر صاحب! انسان صحیح معنوں میں وہی ہے جو انسانیت کا علمبردار ہو۔ جو دوسروں کی خدمت کرنے اور ان کی ویران زندگیوں میں خوشیاں بھرنے کے لیے سدا تیار رہے ۔ خوب صورت اور حسین ہونا انسانیت سے بڑھ کر نہیں ہے ۔ صورت نہیں بلکہ سیرت اچھی ہونی چاہیے ۔ بخدا ! آپ کا مرتبہ میری نگاہ میں بہت اونچا ہے مجھے احساس ہے کہ آپ کس قدر تندہی اور لگن کے ساتھ مریضوں کی دیکھ ریکھ کیا کرتے ہیں ۔۔۔۔" اگلے روز نسرین کو وارڈ سے ملحق سائیڈ روم میں منتقل کیا گیا۔ اور ڈاکٹر ارشد دن میں اُسے ایک دو بار دیکھنے آتے ۔
وارڈ میں سرگوشیاں ہونے لگیں ۔۔۔۔۔۔" آخر ڈاکٹر ارشد کو سائیڈ روم والی مریضہ سے اتنی دلچسپی کیوں ہے ؟"
" ڈاکٹر کا اُداس چہرہ اب ۔۔۔۔۔ بشاش نظر آنے لگا ہے ۔"
۔۔۔۔۔ کہیں ۔۔۔ یہ دونوں ۔۔۔۔۔۔" غرض جتنے منہ، اتنی باتیں ۔
ڈاکٹر ارشد بے فکر ہو کر دیگر مریضوں کے ساتھ ساتھ نسرین کا علاج کرتے رہے ۔ یہ سچ ہے کہ وہ نسرین میں کچھ زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے اور شام کو چھٹی کرنے سے پہلے نسرین کی خیریت ضرور پوچھتے ۔ نسرین کی ماں سے باتیں کرتے نسرین کی تیمارداری کرنے میں ڈاکٹر ارشد کو خاص دلی مسرّت محسوس ہوتی ۔ وہ اُداس اُداس رہنے کے بجائے خوش نظر آتے تھے ۔
ڈاکٹر ارشد کے آنے میں دیر ہو جاتی تو نسرین کی آنکھوں میں بھی شکایت جھانکنے لگتی اور ڈاکٹر کے آنے پر اور ان کے ساتھ باتیں کرنے پر نسرین کے پژمردہ ہونٹوں پر شگفتگی چھا جاتی ۔
دراصل نسرین بیوہ تھی ۔ ایک بچے کی ماں جو پورڈنگ میں رہائش پذیر تھا۔

ایک دن نسرین کی ماں ندیم کو ہسپتال لے آئی ۔ ڈاکٹر ارشد سے اس کا تعارف کرایا۔ ارشد کا خوف ناک چہرہ دیکھ کر ندیم سہم سا گیا اور اپنی ماں کے سینے سے چمٹ کر رونے لگا۔ سمجھانے پر ندیم نہ مانا اور ڈاکٹر ارشد بھی آج زیادہ وقت نسرین کے ساتھ نہ گزار سکے ۔

غرض اِس اُس طرح کی باتیں کر کے ڈاکٹر ارشد نسرین کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اور دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تھے ۔ ایک دوسرے سے مل کر اور مختلف موضوعات پر باتیں کر کے انہیں سکون سا ملتا تھا ۔

اب دھیرے دھیرے نسرین کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی ۔ اور ماں اپنی بیٹی کی اس تبدیلی پر بہت خوش نظر آ رہی تھی ۔

"کیا آپ نے اپنی لڑکی کے لیے کوئی لڑکا ڈھونڈ لیا ہے ——؟"

ایک روز پاس والے بیڈ کی مریضہ نے نسرین کی ماں سے استفسار کیا۔

"ابھی دو سال قبل اس کے شوہر کسی ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئے ہیں ۔ وہی غم اسے کھاتے جا رہا ہے ۔ اس حالت میں دوسری کی بات کیسے چھیڑ دوں ـــ؟" نسرین کی ماں نے جواب دیا۔

اور نسرین ڈاکٹر ارشد کے لائے گئے میگزین کی ورق گردانی کرتے کرتے سو گئی تھی ۔

"بہن ڈاکٹر ارشد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ۔ وہ نسرین میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں ۔ ان کے علاج سے تو نسرین اب صحت مند لگتی ہے ۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو ——؟" نسرین کی ماں نے تعجب کا اظہار کیا ۔

"بہن ناراض نہ ہونا ! اپنی تو عادت ہے دو ٹوک بات کرنا —— اگر ڈاکٹر ارشد میں دلچسپی نہیں تو نسرین کے اچھا ہوتے ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دینا ۔ ورنہ پانی سر سے اونچا گزر جائے گا ——" مریضہ نے صلاح دی ۔

"کیا کہہ رہی ہو ، شرم نہیں آتی ، کیا ڈاکٹروں سے کھل کر بات کرنا بھی

پاپ ہوگیا ــــ" نسرین کی ماں وکالت کرنے کے انداز میں کہہ گئی۔

" میں کیا ــــ سارے ہسپتال میں ان کے چرچے ہو رہے ہیں۔ کس کس کا منہ بند کریں گی آپ ــــ میں تو آپ کے ہی بھلے کی کہہ رہی تھی۔ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام ــــ"

"لیکن ڈاکٹر مجھ کو ماں کہتا ہے، بیٹے کی طرح مجھ سے پیش آتا ہے ...
... اور نسرین کو ....."

"بہن سمجھتا ہے ــــ اور بہن کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔" مریضہ نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"بس کرو ــــ مجھ ابھاگن پر رحم کھاؤ" نسرین کی ماں منہ چھپا کر رونے لگی۔
غیر! اس کی باتیں سن سن کر نسرین کی ماں کے کان پک گئے۔ اور دل چھلنی ہو گیا۔ ــــ وہ سوچنے لگی۔

.... اگر یہ سب کچھ جھوٹ ہے تو پھر سچ کیا ہے؟ ــــ اصل حقیقت کیا ہے؟ ــــ دنیا والے کیوں کیچڑ اچھالنے لگے ہیں۔ آخر کچھ تو صداقت ہوگی ــــ ڈاکٹر ارشد تو شریف آدمی ہیں۔ ڈاکٹر کا کام مریض کی دیکھ بھال کرنا ہے اور وہ اپنا فرض انجام دے رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی خاص توجہ نسرین پر ہی کیوں؟ ــــ انجکشن اور پھل وغیرہ لائے ــــ نسرین کی ماں سوچوں کی دنیا میں کھو گئی۔ اچھا ہے کہ میں نسرین کو ہسپتال سے لے کر گھر چلی جاؤں۔ ورنہ نہ جانے آگے کیا کچھ سننے اور دیکھنے کو ملے گا۔"

سوچتے سوچتے اس نے دل کی بات مان لی ــــ

دو دن کی چھٹی کے بعد جب ڈاکٹر ارشد وارڈ میں داخل ہو کے سائڈ روم کی جانب چلے تو انہیں اپنی دنیا ویران ہوتی نظر آئی۔ انہیں ایسا لگا کہ وارڈ کے در و دیوار ان کا منہ چڑا رہے ہوں۔ ارشد نسرین والی خالی بیڈ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کیا تلاش کر رہے ہیں ـــــ؟" نرس محمودہ نے از راہ شرارت پوچھا۔

"وہ ۔۔۔۔وہ ۔۔۔۔اس بیڈ پر مریضہ تھی ۔۔۔۔۔"

"جی ہاں! وہ چلی گئی۔"

"لیکن وہ تو ابھی تندرست نہیں ہوئی تھی۔ اس حالت میں اسے چھٹی نہیں دینا چاہیے تھی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے سائڈ روم سے نکل کر وارڈ والے مریضوں کا جائزہ لیا۔ کچھ مریض مسکرا رہے تھے۔ ان کی مسکراہٹ میں طنز اور تلخیاں تھیں، مضحکہ خیز زہریلا پن تھا۔

ادھر نسرین کی طبیعت گھر جانے پر اور زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اکثر وہ ڈاکٹر ارشد کو یاد کر کے رویا کرتی تھی۔ سسکیاں بھرتی تھی۔

نسرین کی ماں نے اسے طعنے دے دے کر تشویشناک حالت تک پہنچا دیا تھا! ڈاکٹر ارشد بھی ایک بار بھی اسے دیکھنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ حالاں کہ اسے ایڈریس معلوم تھا۔

ماں کے سمجھانے کے باوجود نسرین ڈاکٹر ارشد کی یاد کو دل سے نہ نکال سکی۔ اس کی کھوئی کھوئی آنکھیں ڈاکٹر ارشد کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئیں لمحہ بہ لمحہ نسرین کا مرض بڑھتا گیا۔ اور جب نسرین کی ماں کو یقین ہو گیا کہ نسرین ڈاکٹر ارشد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تو انجانے جذبات کے تحت اس کے قدم ہسپتال کی جانب بڑھ گئے۔ ڈاکٹر ارشد کی تلاش میں ـــ ہسپتال سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر ارشد کا جموں تبادلہ ہوا ہے۔ اور وہ آج سویرے ہی چلے گئے ہیں۔ نسرین کی ماں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اُمید کی آخری کرن بھی اُفق کے اس پار چھپ گئی۔ تاریکیوں نے دامن پھیلا دیے ۔۔۔۔۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اس کا دل بیٹھنے لگا۔ گھر کا روشن چراغ گل ہو چکا تھا ـــ وہ صامت و حسرت بھری نگاہوں سے اپنی بیٹی کے بے جان جسم کو گھورنے لگی۔ مرے مرے انداز میں ۔۔۔ دفعتاً اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اور لاش سے لپٹ کے وہ اپنی بدنصیبی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سینہ پیٹ کر ماتم کرنے لگی۔ ***

اعترافِ گناہ

امرناتھ کی مقدس کھوہ میں براجمان شیو لنگ کے درشن کرنے کی چاہ میں ملک کے مختلف حصوں سے یاتریوں کا جمِ غفیر پہلگام میں موجود تھا۔

آگے کا سفر پہاڑی تھا اور دشوار گزار راہوں سے گزر کر طے کرنا تھا۔

گورنمنٹ کے ساتھ ساتھ کچھ پرائیویٹ طرز کی انجمنوں کی جانب سے اس پہاڑی سفر کی تکلیف کو کچھ کم کرنے اور یاتریوں کو ہر ممکن امداد فراہم کرنے کی غرض سے طرح طرح کے انتظامات کیے گئے تھے۔ دورانِ سفر خوراک، پانی، گرم کپڑے اور دیگر چیزیں دستیاب رکھنے کی خاطر سرکار نے کچھ محکموں اور شعبوں کے تال میل سے کمیٹیاں تشکیل دی تھیں۔ اسی طرز کی ایک کمیٹی کریم احمد مقامی مڈل اسکول کا ماسٹر، کرشن لال محکمہ خوراک کے سپروائزر اور کرتار سنگھ محکمہ سیاحت کے انسپکٹر پر مشتمل تھی۔

گرم کپڑے، بوٹ اور چھوٹے تمبو فراہم کرنا اس کمیٹی کی ذمہ داری تھی۔ اس سلسلہ میں ان کا واسطہ ٹھیکیداروں سے پڑنا یقینی تھا۔ ٹھیکیدار گرم کپڑوں بستروں

بوٹ وغیرہ کے ساتھ تمبو و شامیانوں کی دکان "کشمیر کیمپنگ ہاؤس" کے نام سے پہلگام میں کھول دی تھی اور یہ چیزیں یاتریوں سے واجب کرایہ حاصل کر کے مہیا کرتے تھے۔ ڈیوڈ نے اپنی دکان کے عقب میں دریا لِدر کے کنارہ سے پتھریلی زمین پر کچھ خیمے نصب کرائے تھے۔ جن میں زیادہ تر ہپی ٹائپ کے سادھو بسیرا کیا کرتے تھے۔

ایک کشادہ تمبو ڈیوڈ نے خاص طور سے کریم، کرشن اور کرتار کے لیے مخصوص رکھا تھا۔ ویسے پہلگام میں رہائش کے لیے یہ خیمے واجب کرایہ پر دستیاب نہ ہوں تو یاتریوں یا سیاحوں کی بہت بڑی تعداد ہوٹل والوں کی من مانی شرح ادا نہ کرپاتی اور نہ چاہتے ہوئے بھی پہلگام سے وقت سے پہلے کوچ کر جاتے۔

اپنے مخصوص ٹینٹ میں یہ چاروں دوست رات گئے تک باتیں کرتے...
... سوم رس سے لطف اندوز ہوتے، یا پھر کبھی کبھار موقع کا فائدہ اٹھا کر گانجے کے کش لے لیا کرتے تھے۔ ان چاروں کی دوستی سارے پہلگام میں مشہور تھی، اور جان پہچان والے ان کے آپسی میل ملاپ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

صبح سویرے چاروں دوست نہا دھو کر اپنی اپنی طرح سے اس کردگار کی عبادت کرتے تھے۔ ویسے اس چھوٹی سی پہاڑی بستی میں جامع مسجد کے ساتھ گوردوارہ اور چرچ بھی آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اپنے ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔

آج خلاف معمول تینوں دوست کریم، کرشن اور کرتار اُداس اُداس سے لگتے تھے۔ دراصل ان کے یار غار ڈیوڈ کو ماریہ کی خودکشی کے سلسلے میں مقامی پولیس پکڑ کے لے گئی تھی، پوچھ تاچھ ہو رہی تھی۔ دراصل ماریہ ہوٹل براڈوے میں بحیثیت ٹیلی فون آپریٹر کام کرتی تھی اور کبھی کبھی ڈیوڈ کی شرکت میں گرجا گھر جا کر اِس جگ کے مالک کو یاد کیا کرتی تھی۔

خیر! تینوں دوستوں نے اپنی اپنی جانب سے اپنا رسوخ لڑایا۔ ڈیوڈ کو پولیس کی حراست سے چھڑا لیا۔ وہ دن اُن کے لیے خوشی سے بھرپور تھا۔ ...

خوشیوں کے لمحات بانٹنے کی غرض سے انہوں نے دو مرغے ذبح کرائے اور کچھ تلی مچھلیاں خرید کے سرِ شام ہی خیمے کا رخ کر گئے ڈلوڈ نے سوم رس کی کچھ بوتلیں پیٹی میں لیے دکان سویرے ہی بند کر دی تھی۔

لدر کا شور، آس پاس کی پہاڑی چوٹیاں، ان میں سے کچھ برف کی قبا اوڑھے

دیودار کے درخت پہرے داروں کی طرح قطار در قطار ایستادہ ------ سرد سرد ہوا چل رہی تھی۔ اس خوشگوار ماحول کو اور سازگار بنانے کی نیت سے چاروں دوستوں نے بھری بوتلیں خالی کرنی شروع کر دیں ---- لمحہ بہ لمحہ ان کے ہوش و حواس ایک ساتھ ڈگمگانے لگے۔ دراصل کل اُن کو یاتریوں کے کارواں کے ساتھ چندن واڑی کے لیے سفر طے کرنا تھا۔ اور اس سفر میں پینے پلانے کی بابت سوچنا بھی پاپ خیال کیا جاتا ہے۔

کچھ پیگ حلق میں انڈیلنے کے باوجود ڈلوڈ مایوس نظر آ رہے تھے۔

چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اور صورت اُتری اُتری تھی۔ کہاں ایک پیگ پینے کے بعد ہی وہ طرح طرح کے لطیفے سنا کر سب کو ہنسا دیتے تھے اور آج خلافِ معمول وہ اداس تھے۔

"ارے ڈلوڈ کے بچے! آج تم بجھے بجھے سے کیوں ہو۔ آخر بات کیا ہے؟" کریم سے نہ رہا گیا اور پوچھ لیا۔

بدلے میں ڈلوڈ سرد آہ بھرتے ہوئے درختوں سے اٹے پڑے پہاڑی ڈھلان کو خالی خالی نظروں سے گھورنے لگا۔

"ارے بے وقوف! اگر ماریہ تمہاری وجہ سے مر گئی ہے، تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس دنیا میں روزانہ۔ ۔ ۔ ہزاروں لوگ مرتے رہتے ہیں اور پھر ہر انسان مرنے کے لیے ہی تو جنم پا گیا ہے۔؟" کرتار نے لقمہ دیا۔

"ارے کون نہیں ہے جس کے ہاتھوں کوئی جرم سرزد نہ ہوا ہو۔ تو کیا پھر جینا چھوڑ دیں؟ پیارے دوست زندگی سے نفرت کیوں ......" کرشن نے

چلم کا کش لیتے ہوئے کہا۔

ڈیوڈ نے جواب میں ایک اور پیگ خشک حلق پر انڈیل دیا اور پھر غیر ارادی طور پر چلا اٹھا۔

"نہیں دوستو! ماریہ نے صرف میری وجہ سے ہی خودکشی کر لی ہے۔ میں نے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔۔۔۔ کاش! میں نے اس کی بے لوث محبت کا مذاق نہ اڑایا ہوتا۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں خونی ہوں۔۔۔۔ خونی —"

اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

کرشن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سہارا دیا۔ چاروں دوست اب مدہوشی کے دریا میں غوطہ زن نظر آرہے تھے۔ دفعتاً ہر ایک کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا اور غم زدہ انداز میں وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے، جیسے ان کو کسی نے خون کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

"ہم سب گناہ گار ہیں۔ ہم سب قاتل ہیں —" سب ایک ساتھ چلائے لگتا تھا ان کے اندر کا انسان جاگ گیا ہو! ان کے ضمیر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ارے دوستو! میں نے خود ایک معصوم کلی کو کھلنے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دیا ہے۔" یہ کریم کی آواز تھی۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب میٹرک کا امتحان پاس کر کے میں آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ ابا مرحوم کی مہربانی سے محکمہ تعلیم میں عارضی طور ماسٹر کا عہدہ سنبھالا۔ دور دراز علاقہ "وری پورہ" کے پرائمری اسکول میں ڈیوٹی پر جا پڑا۔ اس اسکول میں صرف دو ٹیچر تھے۔ راج ناتھ اور میں۔۔۔۔ مقامی مسجد میں نماز ادا کی۔۔۔۔ ایک شریف النفس انسان احمد بابا نے مجھے اپنے گھر میں رہنے کے لیے جگہ دے دی۔ دراصل وہ اسکول میں بحیثیت چوکیدار بھی کام انجام دے رہے تھے۔ میں نے پیئنگ گیسٹ کے طور ان کے گھر میں قیام کیا۔ ان کی ایک نوجوان لڑکی محمودہ تھی۔ احمد بابا کہنے پر وہ میرے پاس صبح و شام قرآن پڑھنے لگی۔

محمودہ کی پھوٹتی جوانی، سینے کے اُتار چڑھاؤ اور سب سے بڑھ کر سادگی سے لبریز حسن نے میری ہوس پرستی کو بھرپور انداز میں ہوا دی ــــ میرے اندر ایک فتور سا سما گیا۔ گو محمودہ کے والدین مجھے ایک بیٹے کی طرح چاہنے لگے! انہیں مجھ پر کافی بھروسہ تھا۔ اس لیے میرے اندر کے چھپے شیطان کو وہ دیکھ نہ سکے۔ میرے ناپاک ارادوں کو وہ بھانپ نہ سکے۔

ایک رات محمودہ کے والدین پاس والے گاؤں میں کسی رشتہ دار کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے گئے اور محمودہ اور اس کا چھوٹا بھائی رحمٰن میرے ساتھ گھر میں رہ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ شام کا کھانا کھا کر رحمٰن جلدی سو گیا اور میں محمودہ کے ساتھ ادھر اُدھر کی اور اِس اُس طرح کی باتیں کرنے لگا۔ آج اس نے سر دھویا تھا۔ گھنے اور لمبے لمبے بال بے ترتیب شانوں پر پڑے ہوئے تھے۔

اس حسن کی فراوانی کے آگے میری حیوانیت اُبھر پڑی۔ اور ہوس پرستی نے میرے سراپا کو زیر کر لیا۔ نہ چاہنے کے باوجود میں نے محمودہ کو اپنے قریب کر لیا۔ اس کے وجود کو اپنے بازوؤں میں مقید کر لیا۔ میری اس حرکت پر محمودہ سخت گھبرا گئی ۔ ۔ ۔ ۔ پسینے میں شرابور وہ مجھے سمجھانے لگی۔ لیکن میری انسانیت مر چکی تھی میں نے شیطان کا روپ دھار لیا تھا۔ اپنی ناپاک خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں نے اسے دبوچ لیا۔ اور دیکھتے دیکھتے محمودہ کی عصمت کی چادر کو میں نے تار تار کر کے رکھ دیا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سلسلہ پھر برابر جاری رہا۔ کبھی مچان، کبھی کھلیان اور چشمہ والی گھاٹی میں جا کے میں اس معصوم کے جذبات سے کھیلتا رہا۔ اور جب محمودہ نے اس اصلیت کا انکشاف کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکنے لگی۔ میرے حواس اُڑنے لگے۔

میں نے محمودہ کو جھوٹی تسلی دی کہ والدین سے بات کر کے اور ان کی رضامندی حاصل کر کے اس کے ساتھ باضابطہ شادی کروں گا۔ وہ پگلی میری باتوں میں آگئی اور اس طرح میں نے شہر کا رخ کیا۔

ایک ماہ کی رخصت لے کر اور کوشش کر کے اپنا تبادلہ کرا لیا۔ نئی جگہ ڈیوٹی پر گئے ابھی دو ماہ ہی گزرے تھے کہ راج ناتھ کے خط سے معلوم ہوا کہ محمودہ نے خودکشی کر لی ہے۔ اس کی لاش پاس والی مسجد کے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔ کوئی یہ نہیں جان سکا کہ اس کا قاتل کون ہے؟ اور کیوں کر اس نے اپنی زندگی کا گلا گھونٹ لیا۔۔۔؟ اُس معصوم نے اصلیت سے کسی ایک کو آگاہ نہ کر کے موت کو گلے لگاتے میں ہی اپنی خوشنودی جان لی۔

میں نے احمد بابا کو تسلّی بھرا خط لکھ دیا۔ لیکن محمودہ کی قبر پر جانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میں نے محمودہ کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا ــــ میں اس کا قاتل ہوں۔ ایک خونی ــ ــ ــ ــ ــ ــ ساتھ ہی کریم زار زار رونے لگا۔

" ارے کریم! چپ کرو ــ تم سے بڑھ کر میں نے کمینہ پن دکھایا ہے۔ پہلی بار میں امرناتھ کی مقدس گپھا کے درشن کرنے جا رہا ہوں اس لیے اپنے گناہ کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ ایک ثقیل بوجھ ــــ جسے میں ہلکا کرنا چاہتا ہوں ــ"، یہ کہہ کر کرشن نے اپنی رام کہانی شروع کر دی۔

" جموں مولانا آزاد کالج میں پڑھائی کے دوران میں نے ایک مقامی لڑکی گیتا سے راہ و رسم بڑھا دیے۔ اور پھر پتاجی کے ساتھ سرینگر آکے گیتا کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران گیتا نے ایک لفافے میں خط کے ساتھ اپنی کچھ تصویریں بھی ارسال کر دیں ــــــ میں نے اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ہی گیتا کے والدین شادی کے لیے رضامند نہ ہوتے ــ! ادھر میرے ماتا پتا بھی اُس شادی کے خلاف تھے۔ میں نے پھر بھی اس بابت تگ و دو کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا ــ دراصل گیتا کے بھائی اشوک اس حقیقت سے واقف ہوتے تھے کہ اس طرح کی خط و کتابت میری اور لڑکیوں سے بھی جاری ہے۔

خیر ــــ گیتا کی شادی جموں ہی میں ہی کی متوقع گر ... کے ... چشم

چراغ ولنود کمار سے ہوگئی ۔ یہ خبر سن کر میرا تن من جل اٹھا ۔ خود غرضی اور بدلہ لینے کی آگ نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ اور انتقامی جذبات اُبھر کر میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کرنے میں کامیاب اُترے ۔ گیتا کی مجبوریوں کو نظر انداز کیے میں نے اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولنے کی بابت شد و مد کے ساتھ سوچنا شروع کیا سری نگر سے جموں جا کے میں نے دیوان مندر میں گیتا سے ملاقات کی ۔

ارسال کردہ خطوط اور تصویریں اس کے پتی کے حوالے کرنے کی دھمکی دی ۔ ۔ ۔ ۔ گیتا تڑپی، روئی، گڑگڑائی، اور پر کٹے پرندے کی طرح میرے قدموں میں ڈھیر ہوگئی ـــ لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا ۔

گیتا نے محبت کا واسطہ دیا اور مجھ سے التجا کی کہ خطوط اس کے حوالے کر دوں، یا پھر ضائع کر دوں تاکہ اس کی آئندہ کی زندگی عزت و آبرو کے ساتھ گزر سکے اور اس کی زندگی میں انقلاب برپا نہ ہو ـــ

میں کمینے پن پر اُتر آیا تھا ۔

میرا ضمیر پراگندہ ہو چکا تھا ۔ میں نے خطوط اور تصاویر واپس کرتے یا ضائع کرتے کے بدلے میں دس ہزار کی رقم طلب کر دی ۔

گیتا چھ ہزار روپے نقد اور کچھ سونے کے زیورات لے کے باہو فورٹ کی گھاٹی میں میرے حوالے کر گئی ۔ میں نے خطوط کا پلندہ اور فوٹو اس کے حوالے کر دیے اور آخری بار گیتا کو گلے لگا کر پیار کرنے لگا ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پرائی ہے اور میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ کسمسائی، اور میرے بازوؤں کے حلقے سے آزاد ہو کر چلی گئی ۔

اس کے بعد میں سرینگر واپس آگیا اور کچھ دنوں کے بعد ایک دوست کے ذریعے معلوم ہوا کہ ونود کمار نے مجھے رقم اور زیور دینے کے روز گیتا کا باہو فورٹ کی گھاٹی تک تعاقب کیا تھا ۔ اور اس نے پھر گیتا پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ دیے ۔ اس کی ساس نے بھی گیتا کا جینا حرام کر رکھا تھا ۔ وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا ۔

ایک روز جموں کے مقامی انگریزی اخبار "کشمیر ٹائمز" میں ایک لڑکی کی تصویر چھپ گئی تھی۔ یہ گیتا کی لاش کی تصویر تھی۔۔۔۔ ہاں ہاں گیتا۔۔۔۔ اس کی لاش دریائے توی کے کنارے ملی تھی ــــ اس نے توی میں ڈوب کر خودکشی کرلی تھی۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔

جیسے افعی ناگوں نے مجھے جگہ جگہ سے ڈس لیا ہو ــــ دراصل گیتا کا قاتل میں ہوں۔ میری وجہ سے اس نے موت کی دیوی کو گلے لگایا ــــ!

میں گناہگار ہوں ــــ کیا بھگوان۔۔۔۔ مجھے اس بُرے پاپ کے لیے۔۔۔۔ معاف کرے گا۔۔۔۔ کبھی نہیں مجھے سزا ملے گی اور ضرور ملے گی۔ میں نے ایک عورت کی زندگی اجیرن کردی اسے خودکشی کرنے پر مجبور کردیا۔"

اتنا کہہ کر کرشن بھی پھوٹ کر رونے لگا۔

"چپ کر اوئے کرشنے!" یہ کرتا رتھا۔

"تم نے کچھ بھی نہیں کیا اوئے! کریم کا جرم بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ ارے مینو دیکھو ــــ میں نے

ایک نیک خصلت و پھول جیسی بیوی کو موت کے مُنہ میں اُتار دیا ہے۔ میں نے اس کے معصوم ارمانوں کی چُنی کو تار تار کردیا۔ کیا بتاؤں ــــ میں نے والدین کی رضامندی سے شادی رچائی تھی ــــ ہاں! امرتا سے میری شادی ہوئی۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ لیکن میرے حواس پر پریم کماری کے کوٹھے کی چھاپ پڑ چکی تھی۔ میری آنکھیں اصلیت دیکھنے سے قاصر تھیں۔

میں امرتا کی بے لوث محبت کی قدر نہ کرسکا۔ اور پریم کماری کے مصنوعی پیار و باغرض ملاپ کے حصار سے میں رہائی نہ پاسکا۔

ہر رات دیر گئے تک پریم کماری کی صحبت میں وقت گزارنا میرا مشغلہ بن گیا۔ پریم کماری پیگ پہ پیگ پیش کرکے مجھے بےبس کرتی اور پھر میری جیب خالی کرتی تھی۔ کاش! میں نے اس کے مکارانہ انداز کو پہلے بھانپ لیا ہوتا۔ میں نے امرتا کا ایک

ایک زیور پریم کماری کی نذر کر دیا ! ساری دولت اس پر لٹا دی اور ایک شام جب کہ حسبِ معمول میں گھر سے نکل رہا تھا۔ امرتا میری بیوی نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور مجھ سے پیار کی بھیک مانگی ۔

میں نے بدلے میں اسے پیٹا۔ اس کی بے عزتی کی اور طعنے تشنے سنائے۔

"تم کون ہوتی ہو میرے معاملات میں دخل دینے والی۔؟ تم تو پاؤں کی دھول ہو —— دھول"

اُس رات جب میں پریم کماری کے کوٹھے پر گیا۔ تو وہاں وہ کسی اور کے سواگت میں مگن تھی ۔ وہ میری طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیسے میرے ساتھ کوئی واسطہ ہو۔

غم و غصہ کی تصویر بنے میں نے زبان وا کرنی چاہی تو پریم کماری مجھ پر برس پڑی —— "نکل جاؤ قلاش کہیں کے۔ میں کوئی بیوی ہوں تمہاری۔ جو ایسے گھور رہے ہو۔؟"

یہ سن کر میرا سارا نشہ اُتر گیا۔ خود غرضی کا لبادہ تار تار ہو گیا —— میں اور میری ہوشمندی ایک ساتھ ڈگمگانے لگی۔ ۔ ۔ ۔

یہ پہلی بار مجھے اپنی غلطیوں کا بجا انداز میں احساس ہوا۔ شکستہ قدموں کے ساتھ واپس گھر کا رُخ کیا۔ اس چاہت میں کہ امرتا کو اپنا کر اس سے معافی مانگ لوں گا۔

گھر کے سامنے صحن میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ قریب جا کر علمیت ہوئی کہ امرتا نے مٹی کا تیل اپنے اوپر ڈال کر کپڑوں میں آگ لگا کر خود کو جلایا ہے ۔ اس کی جلی ہوئی لاش سامنے پڑی تھی۔ پہچانی بھی نہیں جاتی تھی ۔ پولیس نے پوچھ تاچھ کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچ چکی کہ امرتا نے خودکشی کی ہے۔ مرتے وقت بھی اس نے میرے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا ۔

میں اپنی بدقسمتی پر رونے لگا۔ اب بتا کریم،
کرشن اور ڈیوڈ مجھ سے بڑا مجرم ہے کوئی "
اور وہ پھوٹ پڑا ۔ کریم اور کرشن بھی رونے لگے، روتے روتے بے سدھ ہو گئے۔ اور ایک دوسرے پر گر کر نیند کی آغوش میں چلے گئے

ڈیوڈ برابر خلا میں گھور رہا تھا اس نے سوچا کہ اپنی کہانی شروع کر دے۔ لیکن تینوں خراٹے بھر رہے تھے۔ وہ خیمے سے باہر آیا لدر کے کنارے کھڑا سوچنے لگا کہ میں نے ماریہ سے صرف یہ کہا تھا "میں اس کے قابل نہیں، میں سدا کے لیے اس کا نہیں بن سکتا۔ ہم اچھے دوست ہی رہیں گے۔ میاں بیوی کی طرح زندگی گزارنے کی بابت میں نے سوچا بھی نہیں!"

اتنے پر ماریہ نے زہر کھالیا۔ کاش میں نے ماریہ کی لازوال محبت کو پہچان لیا ہوتا۔ آخر میں نے ماریہ کی بے لوث محبت کی قدر نہ کر کے اس کی زندگی کا قافیہ تنگ کر دیا۔ میں قاتل ہوں، کاش میں نے اس کی چاہت کا احترام کیا ہوتا۔ اس کے جذبات کا لحاظ کیا ہوتا۔ اعتراف جرم کر کے ڈیوڈ نے بھی دل پر پڑے بوجھ کو ہلکا کیا اور وہ بھی ٹینٹ میں آکر دوستوں کی طرح بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

صبح سویرے چاروں نے ایک دوسرے کو اپنائیت و اُلفت سے دیکھا۔ ہونٹ خاموش تھے جیسے کسی ایک کو کسی ایک سے شکایت نہ تھی اور پھر نہا دھو کر قافلے کے ساتھ چندن واڑی کی جانب چل پڑے۔

چارہ گر

سپاہی نے جیل کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی رامو کے چہرے پر اُداسی چھانے لگی۔ اس کے تن من میں یاسیت کی لہر دوڑنے لگی۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ اب اُسے بھی کچھ دنوں بعد آزاد کر دیا جائے گا جیسے ابھی ابھی اس کے ساتھی سندر کو آزاد کر دیا گیا۔ اور وہ پھر سے گلیوں، کوچوں کا چکر لگاتا پھرے گا۔ کہیں اسے سر چھپانے کو جگہ نہ ملے گی۔

اتنے میں کوٹھڑی کا آہنی دروازہ بند ہو گیا۔ اور راجو جیسے چونک سا گیا۔ خیالات کی دنیا سمٹ گئی اور رامو نے اپنی کوٹھڑی کے کونے میں ایک اور شخص کو دیکھا جو جیل کی آہنی سلاخوں کو تھامے باہر کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

رامو غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور اجنبی نوجوان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔

"تمہارا نام کیا ہے دوست؟

مجھے رامو کہتے ہیں ـــــــ''

"مجھے راج ناتھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ـــــــ''

"کیا تم نے کبھی چوری کی ہے ـــــــ؟''

"نہیں ـــ!'' راج ناتھ نے مختصر سا جواب دیا اور پھر سے باہر کی جانب گھورنا شروع کیا جہاں برآمدے میں وردی پوش سپاہی بندوق سے لیس بڑی مستعدی سے گشت لگا رہا تھا۔

"تم نے کسی کی جیب کاٹی ہے؟''

"نہیں ـــ!'' راج ناتھ مسلسل باہر کی جانب حسرت سے تکے جا رہا تھا۔

"نہیں ۔۔۔۔ نہیں! تمہیں کس جرم کی پاداش میں اس قید خانہ میں بند کر دیا گیا ہے ـــ؟'' رامو نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے!'' راج ناتھ نے رندھے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"تم سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا؟ ـــــ تو پھر تم یہاں کیوں لائے گئے ہو؟ قید خانے میں ڈالنے کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے ـــ؟''

رامو نے اب قدرے نرم لہجہ اپنایا۔

"صرف اس لیے کہ میں ایک انقلابی ادیب ہوں۔ سچ لکھتا ہوں۔ جھوٹ اور کپٹ سے دور رہ کر میں سرکار کی غلط پالیسیوں کے خلاف بھرپور انداز میں آواز بلند کرتا ہوں ۔۔۔۔

۔۔۔ ان فلک بوس عمارتوں میں مقیم لوگوں سے مجھے سخت نفرت ہے جو غریبوں مجبوروں اور مفلوک الحال لوگوں کا حق چھین کر اور ان کا خون چوس کر اپنے آرام و عیش کا سامان تشکیل دیتے ہیں ـــ یقین کر لو ۔۔۔۔ یہ عالی شان محل غریبوں کی مجبوریوں اور لاچاریوں کے بل پر تعمیر ہو رہے ہیں ۔۔۔۔ غریب ہر جگہ محتاج و مجبور ہے۔''

راج ناتھ جذبات کی رو میں بہہ کر سب کچھ کہتا گیا ـــــ "میں برداشت

نہیں کر سکتا، غریب اور لاچار لوگوں کا جینا ناممکن سا بن گیا ہے۔ غریب ہونا جیسے سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس بے انصافی اور اس زیادتی کو ختم کرنا ہے۔ ۔ ۔ ۔ پست طبقہ سے وابستہ لوگوں کو اپنی محنت کا پھل ملنا ہی چاہیئے۔ آخر وہ بھی تو۔ ۔ ۔ ۔ انسان ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لاکھ سرکار ان سرمایہ داروں کا ساتھ دے۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ عنقریب وہ وقت آئے گا جب یہ فرسودہ نظام بدل جائے گا۔ محنت کش عوام کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی۔ غریبوں کا قبضہ ان امیروں کی تجوریوں پر ہوگا۔ وہ پھر زندگی آرام سے گزاریں گے۔ زمانہ ایک بار پھر ضرور کروٹ بدلے گا۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔"

"میرے بھولے بھالے دوست!" رامو اس کی بات کاٹتے ہوئے بیچ ہی میں بولا ۔

"امیروں کی یہ تجوریاں جن کو تم خالی کر کے غریب و لاچاروں میں بانٹنے کے خواب دیکھ رہے ہو ـــــ اتنی آسانی سے یہ کام سر انجام نہیں پائے گا۔ اس سب کے لیے تمہیں شریفانہ انداز ترک کر کے چوری اور ڈاکہ زنی کا سہارا لینا پڑے گا۔"

"ہاں ہاں ـــــ چوری ـــــ ڈاکہ، نقب زنی ـــــ"

اس کے ساتھ ہی رامو نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ جیسے اس نے سب کی سب تجوریاں خالی کر کے ساری دولت اپنے دامن میں سمیٹ لی ہو۔

راج ناتھ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے منہ پھیر کے باہر کی جانب دیکھنے لگا

حسب معمول رامو جیل کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ صبح صادق گھنٹہ بجنے پر جیل سے ملحق پہاڑی کے دامن میں پھیلے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے چلا گیا۔ راج ناتھ برابر کونے میں پڑی کھاٹ پر سو رہا تھا۔

دن بھر کی محنت کے بعد رامو جب واپس آیا تو راج ناتھ کو اس کی ملحق کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو الفت بھری نظروں سے دیکھا ـــــ "رامو ـــــ تم اپنی زندگی کیوں نہیں بناتے۔ ۔ ۔ ۔

کیوں اپنے آپ پر ظلم کرتے ہو۔؟

اس عمر میں تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ بغاوت کا راستہ اختیار کر لینے کی بجائے اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہو۔ وقت گزرتے کے بعد تم ضرور پچھتاوگے۔"

شام کا کھانا کھانے کے بعد راج ناتھ نے رامو کو اپنی کوٹھری کے درمیان لوہے کی جالی دار حصار کے قریب بلا کر پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

"کیا کہتے ہو دوست ـــــ اب تو لے دے کے یہ چار دیواری ہی میرا سہارا بنی ہوئی ہے۔ باہر جانے کے بعد تو مجھے سر چھپانے کو بھی جگہ نہیں ملے گی۔ میں ان مصائب کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو چار دیواری کے باہر ہر سو بکھرے پڑے ہیں۔ اور۔ ۔ ۔ ۔" راج ناتھ بات کاٹتے ہوتے کہنے لگا۔

"رامو! اس دنیا میں کون ہے۔ جو دکھی اور غم زدہ نہیں۔ اس طرح غلط راستہ اختیار کرنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم صحیح طریقہ اپنا کر سماج کے بے ہنگم اصولوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو۔ جائز طریقہ سے اپنے جینے کا حق سماج کے ٹھیکہ داروں سے مانگو۔ ۔ ۔ ۔ اس فرض کو نبھاو جس کے لیے تمہاری تخلیق ہوئی ہے۔!!

راج ناتھ نے سمجھانے کے انداز میں کہا ـــــ

"نہیں بابوجی! اب میں اس چار دیواری میں پھیلے ماحول کا خوگر بن چکا ہوں۔ یہاں کم از کم مجھے اداسیوں سے واسطہ نہیں۔ اس جیل کی چار دیواری میں اُن مشکلات سے دو چار نہیں ہونا پڑتا جن کا سامنا مجھے جیل کی چار دیواری سے باہر کرنا پڑتا ہے۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اب کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے اس جیل سے آزاد کر دیا جائے گا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد مجھے فوراً ہی کوئی جرم کرنا پڑے گا تاکہ جلد سے جلد دوبارہ اس جیل کے حصار میں آسکوں۔ اس مانوس اور اپنائیت سے بھرپور ماحول میں آسکوں۔ ۔ ۔

یقین مانو بابو جیل سے باہر کی فضا نفرت و حقارت سے لبریز ہے۔ اور

وہ مسموم فضا مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ جیل کی چار دیواری سے باہر کون ہے جو میری دل جوئی کرے ـــ یا میری جانب دستِ اعانت دراز کرے۔

میری حالت ایک آوارہ بادل کے ٹکڑے کی سی ہے جو بے ارادہ و بے مطلب آسمان کی انتہائی وسعتوں میں اِدھر اُدھر پھرا کرتا ہے۔

"میں ایک ایسا مسافر ہوں، جو اپنے قافلے سے بچھڑ کر لق و دق صحرا میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔"

اتنا کہہ کر رامو کی آنکھوں میں آنسوؤں کے گرم گرم قطرے چھلکنے لگے۔ اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

راج ناتھ نے اسے دلاسہ دینے کی خاطر کہا۔

"رامو ـــ! مجھے معاف کرنا، میں نے انجانے میں خواہ مخواہ تمہارے دل کو دکھ پہنچایا ہے ـــ لیکن سچ کہتا ہوں، دوست! کہ تمہارے اندر زندگی بنانے اور کچھ کر دکھانے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف تمہیں ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرار کا راستہ اپنانے سے کسی ایک کے غموں کا مداوا نہیں ہوتا۔

"کیا اس دنیا میں تمہارا اپنا کوئی نہیں ہے ـــ؟"

"میرا ـــ میرا ـــ مطلب ہے تمہارا گھر، تمہارے ماتا پتا ۔ ۔ ۔ ۔ آخر کوئی تو ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟"

"میں ـــ بالکل اکیلا ہوں ـــ! میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔"، اپنی آنسو بھری آنکھیں اپنے میلے سے دامن سے خشک کرتے ہوئے رامو نے برجستہ کہا۔

"بابو ـــ! میرا بھی ایک گھر تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے قریب صرف اپنی ماں کو ہی پایا ـــ کیسے بتاؤں میری غمزدہ ماں نے کتنے لاڈ پیار سے مجھے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ میں ہر روز صبح کو اسکول جاتا۔

اور میری ماں سارا دن گھر میں بیٹھ کر سوت کاتا کرتی تھی۔ کسمپرسی کی حالت میں بھی ہمارے دن خوشی سے گزر رہے تھے۔ اپنے پتا جی کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ــــ جب بھی میں نے اپنی ماں سے ان کی بابت پوچھا ــــ میری ماں کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

میں اپنے سوال کا جواب ماں کے آنسوؤں میں پا گیا۔ اور جیسے تیسے کر کے ہم نے وہ وقت کاٹ لیا۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی زندگی کی وہ رات میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

اُف! کس قدر بھیانک تھی وہ رات ــــ میری ماں پچھلے تین چار روز سے بخار میں تپ رہی تھی۔ رات بھر ماں کی حالت بہت ابتر رہی۔

اگلے روز اسکول سے جلدی واپس آکر جب میں گھر میں داخل ہوا اور کچھ کھانے کے لیے ماں سے مانگا۔

ماں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہاتھ کے اشارے سے بتایا تھا کہ رسوئی میں چھیکے پر تیرے لیے آلو کی ترکاری رکھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اُتار کر کھا لے۔"

لیکن بابو جی! جب میں نے رسوئی میں داخل ہو کر ہانڈی کا ڈھکن کھول کر دیکھا ــــ تو ہانڈی بالکل خالی تھی اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

جب میں ماں کے پاس واپس کمرے میں آیا تو ماں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں ہی مجھ سے پوچھا۔

"بیٹا ــــ! ترکاری کھائی ــــ؟"

بیمار ماں کا دل رکھنے کے لیے میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"ہاں ــــ ماں! کھالی ــــ"

اس پر ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"بیٹا! ایک لقمہ مجھے بھی دے دے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔"

ماں کے یہ الفاظ سن کر میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں بے تحاشہ گھر

سے بھاگ کر بازار میں آگیا ـــــ اور ـــــ نان بائی کی دکان پر سے ۔۔۔۔ ڈرتے ڈرتے میں نے ایک روٹی ـــــ اُٹھائی تھی ۔ اپنی بیمار ماں کی بھوک مٹانے کی خاطر ـــــ !

لیکن ـــــ اس لائن میں اناڑی ہونے کے سبب میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ۔ اور اس ظالم نے میری ایک نہ سُنی اور مجھے پکڑ کر ـــــ پولیس کے حوالے کر دیا ـــــ اس چھوٹی سی چوری کی یاداش میں مجھے ہفتہ بھر کے لیے جیل میں بند رکھا گیا ، میں بہت گڑگڑایا ـــــ رویا دھویا ـــــ لیکن کسی کو مجھ پر رحم نہیں آیا ـــــ

یہ تھا وہ واقعہ ـــــ جس نے مجھے جیل کی چہار دیواری سے مانوس کرا دیا ـــــ جب میں جیل سے رہا ہو کر گھر آیا تو میری دنیا ہی لٹ گئی تھی ۔ میرا اکلوتا سہارا میری ماں اس دنیا سے روٹھ کر سدا کے لیے دور چلی گئی تھی ۔ مجھے بے آسرا کر کے ـــ !

اس کے بعد میں نے متعدد چوریاں کیں ۔ جیبیں بھی کاٹیں ـــــ اور لحظہ بہ لحظہ ایک عادی مجرم بن گیا ۔

صرف ایک روٹی کے لیے مجھے کیا سے کیا بننا پڑا ـــــ ؟ کاش میرا بھی کوئی ہوتا ، جس کے لیے میں زندگی بنانے کی سوچتا ـــــ آخر بھگوان نے میری ماں کو مجھ سے کیوں چھین لیا ۔ کیوں اتنا بڑا ظلم کیا میرے اُوپر" ـــــ

اتنا کہہ کر رامو زار و قطار رونے لگا ۔ اور راج ناتھ اسے دلاسا دینے لگا ۔

"رامو ـــــ تم اپنا دل چھوٹا مت کرو ـــــ اور اس بات کا یقین رکھو کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تمہیں خوشی و راحت سے ضرور واسطہ پڑے گا ۔ بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ۔۔۔۔ ۔ تم مایوسیوں کے بوجھ تلے دب کر اپنے اُوپر ظلم کر رہے ہو ۔ بہتر اپنے آپ کو اس دلدل سے نکالو ۔"

رامو جواب میں کچھ کہے بغیر ہی اپنے بستر پر دراز ہو گیا ـــــ اور

اگلے روز صبح سویرے ہی حسب معمول رامو کھیتوں میں کام کرتے چلا گیا۔

دن بھر محنت کرنے کے بعد جب وہ اپنے قیدی ساتھیوں سمیت واپس آیا تو راج ناتھ کوٹھری میں موجود نہیں تھا۔ رامو کو بڑی تشویش ہوئی کہ راج ناتھ کو کہاں بھیج دیا ــــــ؟ لیکن اس کی یہ تشویش جلد ہی دور ہوگئی ــــــ جب کوٹھری کے باہر پہرہ دینے والے سپاہی نے اسے بتایا کہ راج ناتھ کو جیل سے رہا کر دیا گیا ہے۔

دوسرے سپاہی نے کاغذ کا ایک پرزہ رامو کے ہاتھ میں تھما دیا جس میں راج ناتھ نے اپنے گھر کا ایڈریس تحریر کیا تھا اور رامو سے تاکید کی تھی کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس سے رابطہ قائم کرے۔ اور سیدھا اس کے گھر پہ چلا آئے۔

کچھ دن گزرنے کے بعد رامو کی قید کی میعاد بھی پوری ہوگئی ــــــ اور وہ ایک بار پھر بوجھل قدم اُٹھاتا ہوا جیل کی چار دیواری سے باہر آگیا۔

اس کا دماغ اب بھی جیل کی تاریک کوٹھری میں بھٹک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "اس وسیع نیلے آسمان کے نیچے اس کے لیے سر چھپانے کی بھی کوئی جگہ نہیں ــــــ!

اتنے میں اس کے ذہن میں راج ناتھ کا خیال آیا۔ اس نے مرے مرے ہاتھوں سے جیب سے کاغذ کا وہ پرزہ نکالا۔ پتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کیا۔ پھر اس نے بس اسٹینڈ کا رُخ کیا۔

رام نگر پہنچتے پہنچتے شام کے ملگجے سائے پھیلنے لگے تھے۔ اس نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق ایک جانب چلے جا رہے ہیں ــــــ بلا سوچے سمجھے یا کسی ایک سے پوچھے رامو بھی اسی جانب قدم بڑھانے لگا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سامنے ہی ایک وسیع و عریض میدان میں لوگوں کا جم غفیر تھا۔ ــ ــ ــ ــ اس میدان میں شاید

کوئی بڑا بھاری جلسہ ہو رہا تھا۔ پوری فضاء انقلابی نعروں سے گونج رہی تھی۔

بھیڑ میں جگہ بناتا ہوا جب وہ جلسہ گاہ میں داخل ہوا تو اسے لاؤڈ سپیکر پر ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا ــــ اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"وہی ــــ ہاں وہی ــــ آواز ہے"۔۔۔۔۔ اس کا جیل خانہ کا دوست راج ناتھ بڑے جوشیلے انداز میں تقریر کر رہا تھا۔

"میرے ہم وطن بھائیو۔۔۔۔ میرے نوجوان دوستو! صبر سے کام لو۔ بہت جلد وقت آنے والا ہے۔۔۔۔۔۔ جب ان اونچے اونچے محلوں اور شاندار کوٹھیوں میں قیام کرنے والے گاؤ تکیوں پر آرام فرمانے والے سیٹھ ساہو کاروں کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ ان کی سونے، چاندی سے بھری تجوریاں ہمارے قدموں میں ہوں گی۔

امیری اور غریبی کی یہ تفریق ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہ جائے گی۔ ہمیں اس ملک میں انقلاب لانا ہے ــــ اس ملک سے سرمایہ دارانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ ہمیں اس ملک میں ایک ایسا انقلاب لانا ہے، جس میں صرف انسانیت کا دور دورہ ہوگا۔

اس ملک میں ہماری حکومت ہوگی۔ جس میں ہر طرف سکھ ہوگا، چین ہوگا ــــ"

راج ناتھ کی پُرجوش تقریر جاری تھی ــــ لوگوں کا ہجوم بڑی خاموشی سے اور توجہ سے راج ناتھ کی تقریر سن رہا تھا۔

اچانک پولیس کے دستوں نے چاروں طرف سے جلسہ گاہ کو گھیر لیا اور بے گناہ لوگوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ لوگوں میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ اور لوگ افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔۔۔۔۔۔ غرض جس کا جس طرف منہ اُٹھ رہا تھا ــــ بھاگا چلا جا رہا تھا۔

بہت سے لوگ پولیس کی گولیوں سے زخمی ہوئے اور کتنے ہی لوگ اس اچانک بھگدڑ میں کچل کر زخمی ہو گئے۔

راموبھی اس افراتفری کے ہیبت ناک ماحول میں بھاگتا ہوا سامنے والی گلی میں جاکر چھپ گیا ــــ

اچانک اسے راج ناتھ کا خیال آگیا۔ راج ناتھ کا خیال آتے ہی وہ ہمت کر کے گلی سے باہر نکلا اور لوگوں سے مقرر کے بارے میں معلوم کیا۔ ۔ ۔ ۔ تو لوگوں نے بتایا کہ اسٹیج پر بیٹھے بہت سے لوگ پولیس کی گولیوں سے زخمی ہوئے ہیں ــــ ان میں راج ناتھ بھی تھے اور لوگوں کی بھیڑ جلوس کی شکل میں زخمیوں کو ہسپتال تک لے گئی ہے ــــ ،،

رامو نے جیسے ہی یہ خبر سنی وہ اپنے گردوپیش پھیلے خطرات سے بے نیاز ہو کر بے تحاشہ ہسپتال کی جانب بھاگا اور ہانپتا کانپتا ہسپتال پہنچ گیا۔

راج ناتھ کی حالت کافی ابتر تھی ــــ گولی کن پٹی کے پاس لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے جلدی سے راج ناتھ کو انجکشن لگا دیا۔ اور کچھ ہی دیر کے بعد راج ناتھ کو ہوش آگیا۔

اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں ۔ رامو اس کے سرہانے کھڑا تھا ــــ جیسے ہی اس کی نظر رامو پر پڑی ایک انجانی سی خوشی کی لکیریں اس کے چہرے پر نمایاں ہونے لگیں۔

"میرے ہمدم ــــ ! تمہیں یہ کیا ہو گیا ــــ ؟"

رامو ایک دم کسی بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

"اپنی جان دے رہا ہوں ــــ لیکن ایک بات بہت غور سے سن لو۔ اب تمہیں میرے ادھورے کام کو سنبھالنا ہے!"

پھر

راج ناتھ نے ہاتھ کے اشارے سے ہی اپنی ماں اور اپنی بہن گیتا کو

اپنے قریب بلایا ——— اور رامو سے کہا ۔

" رامو --- اب تم اس دنیا میں --- اکیلے نہیں ہو

جیل سے باہر کی دنیا میں اب تمہارا بھی ایک گھر ہے ۔ جس کی چہار دیواری میں تمہاری ایک ماں ہے ۔ ایک بہن ہے ۔ ان کے لیے اب آئندہ زندگی میں تم کچھ کر کے بن کے دکھاؤ گے، مجھ سے وعدہ کرو "

رامو کی ہچکیاں بندھ گئیں ۔

راج ناتھ کی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن گیتا کے ساتھ ساتھ وہ بھی بلک بلک کر رو رہا تھا ۔ راج ناتھ کی حالت غیر ہوتے لگی ۔ اس نے بمشکل تمام رامو کے پھیلے ہوتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور ایک حسرت بھری نظر اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن گیتا پر ڈالی اور ساتھ ہی آخری ہچکی لے کر سدا کے لیے اس دارِ فانی سے ناطہ توڑ لیا ۔

دلِ شکستہ

"ایک بات کہوں، بُرا تو نہ مانو گے؟"

"کہو ـــــ"

"تم بزدل ہو ـــــ!"

یوسف نے میرے الفاظ پر کان کھڑے کر لیے اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

"میں اور بزدل ـــــ بہت خوب ـــــ!"

"ہاں ہاں ـــــ تم بزدل اور ڈرپوک ہو۔ ممتاز کے گھر کے چکر کاٹتے کاٹتے تمہارے پاؤں کے تلوے تک گھس گئے۔ لیکن حد یہ ہے کہ تم اس کا سامنا تک نہیں کر سکتے۔ اس کے سامنے آتے ہی تمہاری گھگی بندھ جاتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ عاشقی کا دم بھرتے ہو ـــــ"

اس بار میرے لہجے میں طنز تھا۔ ۔ ۔ ۔ جواب میں یوسف نے گہرا سانس لیا اور گنگنانے لگا۔

جنہوں کا عشق صادق ہے وہ کب فریاد کرتے ہیں
لبوں پر مہر خاموشی، دلوں میں یاد کرتے ہیں

" میرا ایک مشورہ ہے، مانو گے ؟"

" کہیے ــــ"

" اخروٹوں کی ایک مالا بنا کر رات دن منکے پھرا کر۔ "ممتاز ممتاز" جپنا شروع کر دو۔ شائد من کی مُراد پا جاؤ ! اور خدا کرے کہ اس کا دل پسیج جائے ــــ"

میرا مشورہ سن کر یوسف کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ اور نہایت خفگی سے بولا ــــ

" تمہیں تو حسن ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے !"

" اچھا بھئی لو اب ہم سنجیدہ ہو گئے۔ میں تو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا برخوردار کہ جب تک ممتاز سے اظہار محبت نہ کرو گے تو وہ کیسے جان سکے گی کہ تم اس سے پیار کرتے ہو ــــ میرا مطلب ہے کہ اگر تم اس سے محبت کرتے ہو تو اس حقیقت کا انکشاف کرنے میں تمہیں کیا خوف ہے۔"

"کاش ! میں ایسا کر سکتا ــــ۔" یوسف غیر ارادی طور پر کہہ گیا۔

"کیوں زبان کو تالا لگا ہے کیا ؟"

" نہیں ــــ یہ بات نہیں حسن ! میں سمجھتا ہوں کہ سچی محبت اگر زبان کے بجائے آنکھوں کی خاموش زبان سے جتلائی جائے تو زیادہ متاثر ہوا کرتی ہے ــــ میں نظروں ہی نظروں میں اس محبت کا پیغام ممتاز تک پہنچانے کا قائل ہوں۔ محبت کی روئیداد زبان پر لائی جائے تو کیا رسوائی نہ ہو گی ــــ ؟"

یوسف کے اس فلسفیانہ انداز نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اپنی ہار نہ مانتے ہوئے میں نے کہا۔

" اور تم جیسے فلسفی عاشقوں کی قسمت میں بے نیل و مرام مرنا لکھا

ہوتا ہے —— پیارے! میرے خیال میں محبت نام ہے ایک زندہ جاوید و دلچسپ دھوکے کا ——"

"میری یہ بات شاید اسے ناگوار گزری اور وہ میرے کمرے سے باہر چلا گیا! یوسف کا یوں روٹھ کے چلے جانا میرے لیے نئی بات نہ تھی۔ وہ کتنی ہی بار باتوں باتوں میں روٹھا کرتا تھا۔"

یوسف میرا پڑوسی ہے۔ دونوں کی عمر میں کچھ فرق ہونے کے باوجود وہ میرا لنگوٹیا یار ہے۔

روٹھنے کی عادت اسے بچپن سے ہی ہے، شاید اس لیے کہ والد اور چچا کی مشترکہ پھلواری میں یوسف نام کا پہلا غنچہ ہی پھوٹا تھا جس نے کالج کی دہلیز کو چھوا تھا۔ فیشن کے میدان میں بھی یوسف بہت آگے چلا گیا تھا۔ وقت برق رفتار گھوڑے پر سوار گزرتا گیا۔ اور ہم یونہی کبھی روٹھتے کبھی ہنستے اپنی زندگی کے ایام گزارتے گئے کہ ایک روز لال چوک سے قریب ایک لداخی لڑکی سے ہماری ملاقات ہوئی۔ سچ کہتا ہوں وہ بلا کی حسین تھی۔ خوب صورت چہرہ، دلکش خدوخال سُرخ سُرخ ہونٹ گویا ابھی پان چبایا ہو۔ خوب صورت چینی قسم کی ناک، پُرکشش آبرو اور لمبی لمبی نوک دار پلکیں، چمکدار نیلی نیلی آنکھیں کشش پیدا کر رہی تھیں —— اور جسم پر موٹا سا مٹیالے رنگ کا چوغہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔

میری طبیعت اُس سے باتیں کرنے کو مچلی اور میں نے از راہ شرارت پوچھا —— "کیا بیچتی ہو ——؟"

"سب کچھ —— ہینگ ہے، جیرا ہے —— سلاجیت ہے —— اور خشک خوبانی ہے —— کیا لوگے ——؟"

"پریم بوٹی ہے؟"

"وہ کیا ہوتا ہے بابو؟" اس کی آنکھوں میں معصومیت کے جام چھلکنے لگے —— مجھے اس کے انداز بیاں پر ہنسی آ گئی۔

"تم نہیں جانتی ــــ؟"

"نہیں بابو ـــــــ!"

"پریم بوٹی سے کسی کو بھی اپنے بس میں کیا جاسکتا ہے۔؟"

"کس کو چاہیے یہ بوٹی ـــــ؟"

"اِس کو ـــ!" میں نے یوسف کی طرف اشارہ کر دیا۔

"میری اس حرکت پر یوسف جھینپ سا گیا۔ کچھ لمحہ ہم تینوں چپ رہے ایک دوسرے کو تکتے رہے، پھر یکا یک وہ بولی۔

"بابو ہم منتر جانتا ـــ"

"کیسا منتر۔ ۔ ۔ ۔؟"

"پریم منتر۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

"اچھا ـــــ" کہہ کر میں نے یوسف کی طرف معنی خیز نظروں سے تاکا اور پھر لڑکی سے پوچھا ـــ

"ہاں ـــ تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"آج رات دودھ گنگا شمشان گھاٹ آجاؤ میں منتر سکھا دونگی۔"

یوسف تجسس سے اسے گھور رہا تھا۔

"تمہارا نام ـــــ؟" میری زبان کام کر گئی ـــ

"تاشی۔ ۔ ۔ ۔" اس نے ذرا بے رخی سے جواب دیا۔ میں نے موضوعِ سخن بدل دیا تھا۔ جو غالباً اسے اچھا نہ لگا۔

دفتر کا وقت ہو رہا تھا، ہم آگے بڑھنے لگے اور یوسف دور تک مُڑ مُڑ کے اس لداخی دوشیزہ کو دیکھتا رہا۔

کچھ روز گزرنے پر پلنگ پر لیٹے لیٹے "یادوں کی برات" کی ورق گردانی کرنے میں محو تھا کہ یوسف نے کمرے میں قدم رکھا۔ رات کے قریب گیارہ بج چکے تھے ـــ "حسن! میرے ساتھ چلو"

"کہاں ــــــ؟"

"شمشان گھاٹ" ــــــ تاشی نے بلایا ہے۔ انتظار کر رہی ہوگی۔"

"عقل کے ناخن لو، یوسف گھر جاکر آرام سے سو جاؤ۔ سالی انتظار کر کے خود چلی جائے گی ــــــ کیا تمہیں اس کے کہنے پر یقین آگیا؟ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔"

"نہیں حسن!" یوسف بات کاٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مجھے تاشی کل پھر ملی تھی ۔ اُس نے یقین دلایا کہ پریم منتر سیکھنے سے ممتاز میرے ارد گرد منڈلانے لگے گی۔ جیسے پروانے شمع کے گرد منڈلاتے ہیں۔ مجھ سے اب ممتاز کی بے رخی برداشت نہیں ہوتی۔ یہ منتر سیکھ کے میں اس کے غرور کو توڑ دونگا۔"

میں نے ساتھ چلنے سے انکار کیا اور کہا۔

"تو ضعیف الاعتقادی کا ہدف بن گیا ہے۔"

یوسف سُنا اَن سُنا کر کے کمرے سے باہر چلا گیا ــــــ میں سوچتا رہا کہ محبت کتنی دیوانی ہوتی ہے۔ پڑھا لکھا آدمی بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ غرض ساری رات طرح طرح کے خیالات آتے رہے اور نیند کوسوں دور ــــــ ــــــ میرے تصورات کا مرکز یوسف تھا۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

اگلے روز میں نے کوشش کی کہ ممتاز سے مل کے اس کی کیفیت جان سکوں! دفتر سے جلدی چھٹی کر کے ممتاز کے اسکول کے باہر اس کا انتظار کرنے لگا۔ کیوں کہ وہ مقامی مڈل اسکول میں استانی کے فرائض انجام دیتی ہے۔ ممتاز اسکول سے باہر آئی تو علیک سلیک کے بعد میں نے یوسف کی بات کیا چھیڑی کہ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

"کس دل پھینک کی بات کر رہے ہیں آپ؟ اُسے اپنے آپ پر اعتماد ہی نہیں۔ وہ کسی دوسرے کی بہبودی کی بات کیا سوچ سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر ممتاز اپنی کسی سہیلی کے ہمراہ شانِ بے نیازی کے ساتھ چلتی بنی اور میں نے گھر کا رخ کیا۔

حسب عادت جب یوسف میرے گھر آیا اُسے دیکھتے ہی میں نے دکھتی رگ کو چھیڑا۔

"کیا تمہیں یقین ہے یوسف کہ پریم بوٹی سے ممتاز کو بس میں کر سکو گے۔"

" دیکھ لینا حسن کہ ممتاز کیسے میرے پیچھے پیچھے گھومے گی۔ میں اسے خوب تڑپاؤں گا ——"

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

ہاں! تو میرے دوست! پریم بوٹی کا کورس کتنے دن میں ختم ہوگا ——؟"

"پندرہ روز میں ....!"

"بہت لمبا کورس ہے۔ اگر جان کی امان پاؤں تو ایک منٹ کا کورس بتاؤں۔"

وہ کیا ——؟"

" ممتاز سے مل کے اپنی محبت کا اظہار کر دو۔ تاکہ آمنے سامنے معاملہ طے ہو جائے ——"

میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر ہنسی نام کو بھی نہ آئی۔ بلکہ وہ غمگین ہو گیا۔ جیسے اس کے احساسات کی نگری میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

ویسے یوسف کو یار دوستوں سے جھگڑا مول لینے سیاسی میدان سے لے کر کھیل کود کے اکھاڑے تک داؤ دکھانے اور ادبی محفلوں میں ہنگامہ کھڑا کرنے میں ید طولے حاصل تھا۔

لیکن محبت کے معاملے میں وہ طفل مکتب ہی تھا۔ کبھی حقائق کا سامنا کرنے کی زحمت اس نے گوارہ ہی نہیں کی۔

مشکل سے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ سننے میں آیا کہ ممتاز کی شادی کی بات طے ہوگئی ہے —— وہ بھی اُس شخص کے ساتھ جو عمر میں اس سے کم از کم بیس سال بڑا تھا —— گو ممتاز باصلاحیت، ضدی اور کسی حد تک ترش مزاج ہے لیکن اپنے والد کے سامنے صدائے احتجاج بلند کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔

ممتاز کے ارمانوں کا خون ہو جائے یا محبت کی قدریں پامال ہوں اُس کے والد کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ساہوکار کی طرح لین دین سے کام لینا جانتا ہے۔

یوسف کو یہ خبر سنانے کے لیے میں اس کے گھر گیا۔ مگر وہ موجود نہ تھا۔ میں نے انتظار کیا، لیکن رات گئے تک وہ واپس نہیں لوٹا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے قدم خود بخود شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑے۔

شمشان گھاٹ کے ایک گوشے میں ایک الاؤ جلایا گیا تھا۔ جس کی روشنی میں تاشی اور یوسف کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ تاشی کچھ پڑھ رہی تھی۔ میری موجودگی کا احساس ہوا تو دونوں جھینپ سے گئے۔

"اِتنی رات گئے تم یہاں؟" یوسف کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یوسف! چھوڑو اس ڈھونگ کو۔ اب منتر سیکھنے کی ضرورت نہیں رہی!"

"کیوں ـــــ!" اس نے حیرانی سے پُوچھا۔

"اس لیے کہ ـــــ ممتاز کی شادی طے ہو چکی ہے"۔ میں نے انگریزی میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو ـــــ؟" یوسف انتہائی تعجب خیز انداز میں بولا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں نے بھی آج ہی سنا ہے۔"

"لیکن حسن! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

آخر کار یہ اَن ہونی ہو گئی۔ اور وہ دن آ گیا جب ممتاز یوسف کے ارمانوں کی رانی کسی اور کی دنیا آباد کر گئی۔

یوسف کی زندگی کے سمندر میں ایک طوفان اُٹھا۔ اور گزر گیا۔ میں نے اس معاملہ پر پھر کبھی یوسف سے بات نہیں چھیڑی۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ممتاز کی شادی کے بعد یوسف کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ اب اس کے چہرے پر بشاشت اور زندگی کے نقوش نظر نہیں آتے۔ وہ

سدا کھویا کھویا سا نظر آتا ہے۔ اور محبت کے نام سے اس کا رواں رواں کانپ اُٹھتا ہے۔

یوسف کی پژمردہ حالت دیکھ کر میں اکثر تڑپ اُٹھتا ہوں۔

کل جب میں نے باتوں باتوں میں یوسف سے پوچھا کہ اس طرح ممتاز کی جدائی اور اس کے غم میں کب تک اپنی زندگی کو روگ لگائے رہو گے۔ کسی اور کا دامن تھام لو تو بہتر رہے گا۔"

جواب میں یوسف نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

"حسن! اب دل چاہتا ہے کہ اس دنیا سے اُٹھ جاؤں، کیوں کہ مجھ جیسے شکستہ دل کو اب زندگی میں کچھ دل کشی دکھائی نہیں دیتی۔"
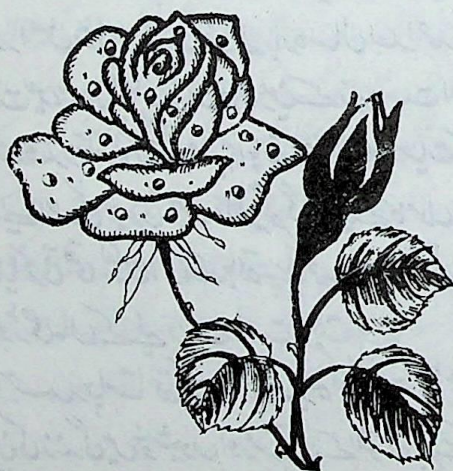
خدا کی دین

احمد اپنے بوڑھے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔

دراصل شادی رچانے کے بارہ سال بعد احمد پیدا ہوا تھا۔ ابھی وہ دسویں جماعت میں ہی زیرِ تعلیم تھا کہ والدین کے زبردست اصرار کرنے پر اُسے اپنی چاہتوں کا پلندہ نذرِ آتش کرکے رضیہ کا ہاتھ اپنی شریکِ حیات کے طور پر تھامنا پڑا۔

ویسے احمد کی چھوٹی بہن فاطمہ گھر گرہستی کے کاموں میں اپنی بوڑھی اور لاغر ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ لیکن اس کے ہاتھ پیلے کرنے اور ڈولی میں سوار کرنے پر گھر میں کوئی نہ تھا جو بوڑھی ماں کے لیے دست راست ثابت ہو۔

گو احمد چاہتا تھا کہ وہ آگے پڑھ لکھ کر کسی قابل بن سکے اور اپنے بوڑھے والدین کی زندگی میں خوشیوں اور مسرتوں کے نقوش بھر سکے۔ اُسے ہر طرح اور ہر موضوع پر لکھی ادبی کتابوں سے والہانہ عشق تھا۔

شادی نہ کرنے کی بابت اس کی زبان احتجاجاً کھلی تھی۔ لیکن اس کے والدین نے کچھ اس طرح سے اپنی ضرورت و مجبوری ظاہر کی کہ احمد نے ہتھیار ڈال دیئے

رضیہ سے منسلک ہونے پر بھی احمد نے تعلیم و تادیب کے دامن کو ہاتھوں سے نہ جانے دیا۔ میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج کی فیس و دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے اور اپنے والدین پر بوجھ نہ بننے کی نیت سے احمد کچھ لڑکوں کو فالتو وقت میں پڑھانے لگا۔

اب احمد کے والدین کی صرف ایک چاہت تھی کہ ان کے اس دنیا سے اُٹھ جانے سے قبل رضیہ کی گود بھر جائے۔

دیکھتے ہی دیکھتے چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن احمد کے والدین کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

اب تعویذ گنڈوں سے کام لیا جانے لگا۔ پیروں، فقیروں کے در پر حاضری دی جانے لگی۔ آستانوں اور مقبروں پر جا کر منتیں، مرادیں مانگی گئیں۔ لیکن سب بے سُود۔۔۔۔۔! ان ساری کوششوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

جب تعویذ گنڈوں سے پوری طرح مایوسی ہو گئی۔ تب ڈاکٹروں اور حکیموں کی جانب رجوع کیا گیا۔ انہوں نے احمد کے والدین کو یقین دلایا کہ حالات پوری طرح سازگار ہیں کسی طرح سے بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی احمد کے سونے آنگن میں کوئی کلی نہیں مسکرائی۔ کوئی پھول نہیں کھلا۔

اب احمد کے بوڑھے والدین کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے سر اُبھارنے لگے اور تو اور ـــــ وہ احمد کی دوسری شادی کی بابت پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگے۔ لیکن احمد نے ان کی ایک نہ سنی اور ہر مرتبہ اپنے والدین کے تقاضے کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ ٹالتا رہا۔

احمد کہتا۔

" ابا حضور! بھلا اس میں رضیہ کا کیا قصور ہے ـــ؟ یہ تو اس

پروردگار کی مرضی پر منحصر ہے کہ کسی کی کھیتی کو ناامیدی کے خوشوں سے بھر دے۔ پروردگار کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔"

لیکن احمد کے والدین کو اپنے خاندان کا نام روشن و زندہ رکھنے کے لیے ایک پوتے کی ضرورت بڑی طرح ستا رہی تھی۔ انہوں نے احمد کو دوسری شادی کرنے پر پھر سے مجبور کرنا شروع کر دیا۔

اسی دوران احمد مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لکھنؤ کے اگری کلچرل کالج میں داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اپنے والدین اور رضیہ سے رخصت لی۔ چھوٹی بہن فاطمہ سے کچھ رقم اُدھار لے کر احمد لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گیا۔

کالج میں داخلہ لیا۔ ہوسٹل میں شفٹ ہو گئے۔ یہاں کھانا بہت ناقص ملتا تھا۔ احمد نے مجبور ہو کر کھانے پینے کے لیے کالج سے ملحق مومن ہوٹل سے رابطہ قائم کر لیا۔ ہوٹل کے مالک ستار صاحب کے لاڈلے بیٹے عباس کو جو کہ دسویں کلاس میں دو بار فیل ہو چکا تھا احمد پڑھانے لگا۔

کھانے پینے کے عوض احمد نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور رات کو بہت دیر گئے تک عباس کے خشک ذہن کی آبیاری کرتے لگا۔

عباس کی شرکت میں احمد نے اس بڑے شہر کے طول و عرض کو ناپنا شروع کر دیا۔

دیکھنے کے قابل مقامات کی زیارت کی بھول بھلیاں، ستی چوک، کپنی باغ چڑیا گھر، وکٹوریہ چوک، مینا بازار، عالیا غ، نخاس، بڑا اور چھوٹا امام باڑہ، امین آباد قیصر باغ وغیرہ۔

اتنے میں محرم الحرام کا مہینہ شروع ہو گیا۔ اور لکھنؤ کے طول و عرض میں اداسی اور مایوسی کی فضا طاری ہونے لگی۔ ہر فرد سیاہ لباس زیب تن کیے واقعہ کربلا کی تشہیر کرنے میں کچھ نہ کچھ دبی زبان میں دہرایا کرتا تھا۔

احمد کو خود بھی اس عظیم المرتبت واقعہ سے دلی انسیت تھی اور ان ایام کی یاد تازہ کرنے کی نیت سے مرثیہ اور نوحہ خوانی میں پیش پیش رہتا تھا۔

میر انیس اور دبیر کے مرثیوں میں سے اکثر اس نے زبانی یاد کر لیے تھے احمد کی یہ روش عباس پر بھی ظاہر ہو گئی۔ وہ اکثر امام عالی مقامؑ کی شہادت اور مظلومی کی بابت باتیں کرتے اور آنکھیں نم کیا کرتے تھے۔

آج رکاب گنج میں نزاب علی کے یہاں مجلس تھی۔ عباس کے اصرار پر احمد نے بھی مجلس میں شرکت کی۔

آٹھویں محرم کی شب تھی۔ ایک صاحب ممبر پر آئے اور حضرت عباسؓ کی شہادت کا واقعہ بہت مؤثر انداز میں بیان کیا کہ کس طرح اپنے آقا امام حسینؑ پر اپنی جان عزیز قربان کر دی۔

"بازوئے مبارک کٹوائے، سارا جسم تیروں اور بھالوں کے زخموں سے چھلنی ہوا۔"

کسی اور صاحب نے حضرت زینبؑ (حضرت امام حسینؑ کی بہن) کی وفاداری کی داستان بہت جذباتی ڈھنگ سے سنائی یعنی واقعہ کربلا تمام ہوتے پر اس شہنشاہ کربلا کی بہن نے بے پردہ ہو کے کیسے ناموسِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی۔

اتنے میں عباس کی سفارش پر مائک پر احمد کا نام پکارا گیا۔

چار و ناچار احمد اپنی جگہ سے اُٹھا اور واقعہ کربلا کی فضیلت بیان کرنے کے بعد اس نے چھے مہینے کے معصوم مجاہد علی اصغرؑ کی شہادت کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

"جب کہ سب عزیز و اقارب شہادت کا درجہ پا گئے۔ تو حضرت امام حسینؑ نے آواز دی۔

ہے کوئی جو میری مدد کرے؟

تو اس چھے ماہ کے معصوم نے اپنے آپ کو جھولے سے گرا لیا۔ یہ جتانے کے لیے کہ مولا! میں تیار ہوں نصرت کے لیے!

اور پھر لخت جگر کو گود میں لیے دشمن کے سامنے لاتے اور اس معصوم کے لیے پانی مانگا۔

اے فوج جفا شعار! اگر تمہارے زعم باطل میں ہم قصور وار ٹھہرے لیکن اس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ اسے تو پانی دے دو میرا معصوم بچہ جان کے نہیں بلکہ بندۂ خدا جان کے ۔۔۔۔۔

بدلے میں حرملہ لعین کا تیر تشنہ لب معصوم اصغرؓ کے حلق کو چھیدتا ہوا نکل گیا۔

امام عالی مقامؑ نے اصغرؓ کا خون ہاتھوں میں لیا ۔۔۔۔ چاہا کہ آسمان کی طرف پھینکیں کہ آواز آئی ۔

آقا! اس بے گناہ کا خون میری جانب نہ پھینکو ــــ ورنہ قیامت تک بارش نہیں ہو گی۔

امام عالی مقامؑ نے چاہا کہ زمین پر پٹخ دیں لیکن آواز آئی۔

مولا! اس معصوم کا خون میرے سینے پر نہ پھینکنا۔ ورنہ ایک دانہ اناج کا قیامت تک نہیں اُگے گا۔

پھر حضرت امام حسینؑ نے اس معصوم کا خون اپنے چہرے پر ملا۔ اپنی داڑھی رنگین کر دی ــــ وامصیبتاہ"!

ہر ایک شخص نے احمد کو داد و تحسین سے نوازا۔

اگلی شب احمد نے حضرت سکینہؓ امام عالی مقامؑ کی لاڈلی بیٹی کا واقعہ دہرایا تو حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔

اس میں سید اصغر شاہ پیش پیش رہے۔

شاہ صاحب نے احمد کو ہوٹل اور ہوٹل دونوں کو چھوڑ اپنے وسیع و عریض بنگلہ میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

گو احمد نے بہت سے حیلوں اور بہانوں سے کام لیا۔ لیکن شاہ صاحب

نے اس کی ایک نہ مانی ۔

غرض ایک سجا سجایا کمرہ رہنے کے لیے مل گیا اور پھر فالتو وقت میں شاہ صاحب کی لاڈلی لڑکی رضوانہ کو احمد پڑھانے بھی لگا۔ جو فرسٹ ایر کا امتحان دینے والی تھی ۔

رضوانہ اچھے خدوخال کی مالک تھی اور بڑی حد تک ضدی و منہ پھٹ تھی. نوکر تو در کنار ـــــ اپنے والدین سے بھی وہ کرخت انداز میں کلام کرتی تھی. ۔ ۔ ۔ کورس کی کتابوں میں دل چسپی لینے کی بجائے وہ رومانی ناول زیادہ شوق سے پڑھتی تھی۔ فلم بینی، عشقیہ گانے سننے کی بہت دلدادہ تھی اور کوٹھی میں ہر کسی پر اپنا رعب جمانا وہ پیدائشی حق سمجھتی تھی ۔

دراصل وہ اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی۔ شاہ صاحب نے بھی رضوانہ کو ضرورت سے زیادہ ہی آزادی دے رکھی تھی ۔ اس نے احمد کو بھی اپنی آزادانہ زندگی سے وابستہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن احمد نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور بڑی سلیقہ مندی سے رضوانہ کی ہر غیر واجب بات کو ٹھکرانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی ۔

بار بار احمد نے رضوانہ کو سمجھاتے اور بُرے بھلے میں تمیز کرانے کی کوشش کی ۔ لیکن احمد کی ہر کوشش بے سود رہی اور رضوانہ کی آزاد طبعی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی روز باغ میں ٹہلتے ہوئے احمد چونکے ۔

رضوانہ کسی نوجوان سے سرگوشی کے انداز میں باتیں کرنے میں محو تھی اُن کی گفتگو سے ایسا لگا کہ وہ ایک دوسرے کو بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ لڑکا بار بار رضوانہ کو گھر سے بھاگ چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔

شام کو جب رضوانہ احمد کے پاس پڑھنے کی غرض سے آئی تو رضوانہ سے احمد نے تھوڑی دیر پہلے دیکھے واقعہ کے بارے میں استفسار کیا اور اسے بتایا کہ نوجوان کی نیت اس کے جذبات سے کھیل کر اس کی زندگی کو ویرانی کے

غار میں دھکیل کر غائب ہو جائیگی ہے۔ ضرور ایک دن تم کو دھوکہ دے کر چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت زیادہ محبت جتانے والا شخص دھوکہ باز ہوا کرتا ہے۔ فریبی ہوا کرتا ہے ـــــــ عاشق صادق نہیں،،

لیکن رضوانہ نے احمد کی نصیحت کو ان سُنی کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر رضوانہ کی زندگی میں اُس وقت زبردست انقلاب بپا ہوا جب کہ ایک روز فیاض اچانک شہر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ـــــــ وہ بھی رضوانہ کا سب کچھ لوٹ کر اُسے پوری طرح برباد کرنے کے بعد۔

رضوانہ فیاض کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی۔ احمد اس ساری صورت حال سے پوری طرح باخبر تھا۔

رضوانہ نے بہت کوشش کی کہ وہ آنے والے بچے کو کسی طرح روک دے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر احمد نے یہ گناہ عظیم اسے اپنے سر لینے کی اجازت نہیں دی۔

"رضوانہ ـــــــ! تمہیں حق نہیں ہے کہ تم اس بے گناہ کا خون کر دو۔ ایسا کرنا دنیا کے کسی مذہب میں بھی جائز نہیں ہے۔ یہ فعل ایک انسان کو قتل کرنے کے مترادف ہوگا۔"

اچانک احمد کے دل میں ایک نئے خیال نے سر اُبھارا۔ رضوانہ کی عزت بچانے کی خاطر اس نے شاہ صاحب کو محرم راز بنا کر ان کی بیٹی سے متعہ کر لیا۔
(متعہ --- مقررہ مدّت کے لیے عارضی شادی کا نام ہے)

شاہ صاحب کے علاوہ بقیہ سارے رشتہ دار اس متعہ کے خلاف تھے۔ لیکن شاہ صاحب اصلیت سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے کسی ایک کی نہ سُنی۔ غرض یہ کہ دنیا والوں کی نظروں میں رضوانہ احمد کی بیوی کا روپ دھار گئی ـــــــ

لیکن احمد نے ایک ہی کمرے میں رہنے کے باوجود اُسے ہاتھ تک نہ لگایا! جب بھی رضوانہ اس کے قریب آنے کی کوشش کرتی، رضیہ کی بھولی بھالی سی صورت

اس کے تصور میں رقص کرنے لگتی اور احمد کسی بہانے اس سے دامن بچانے میں کامیاب ہو جاتا۔

اُس نے رضوانہ پر یہ حقیقت بھی آشکارا کر دی کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ وہ اسے ایک شوہر کا پیار ہرگز نہیں دے سکے گا۔ اس نے صرف دنیا والوں کی نظروں میں اس کی عزت بچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔

اُس وقت کوٹھی بقعہ نور بنی ہوئی تھی جب کہ رضوانہ نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ نومولود کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک سلیقہ شعار دایہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ رضوانہ کی ماں بھی بچے سے خوب پیار کرنے لگیں۔

اِدھر متعہ کی میعاد ختم ہو جانے کے بعد رضوانہ کو ایک بار پھر آزادی مل گئی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے بال و پر پھیلانے شروع کر دیے۔

احمد کے بار بار سمجھانے کے باوجود بھی رضوانہ پھر سے اپنے من پسند عاشق کو ڈھونڈنے لگی۔ ــــ وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس بار رضوانہ نے نواب صادق علی کے انور نظر کو اپنی بے باک نظروں کا نشانہ بنایا۔ انور بھی بڑا رنگین مزاج نوجوان تھا۔

احمد کو جب رضوانہ کے اس نئے معاشقہ کا علم ہوا تو اس نے اس نئے خطرے سے اس کے والدین کو آگاہ کیا اور انہیں یہ صلاح دی کہ رضوانہ کی شادی کسی شریف گھرانہ میں کر دیں۔

لیکن بدلے میں رضوانہ کی والدہ اس پر برس پڑیں۔ کیوں کہ وہ اصلیت سے بے خبر تھیں۔ ان کے خیال میں رضوانہ کی زندگی برباد کرنے والا صرف احمد ہی تھا۔ لیکن احمد نے چپ سادھ لی۔

وقت نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ اور شاہ صاحب کی کوٹھی کے در و دیوار سے مایوسی اور پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ جب کہ سننے میں آیا کہ رضوانہ اپنے آشنا انور کے ساتھ شہر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ اس نے تمام زیور کے ساتھ

ساتھ سیف ہی سے کچھ نقدی بھی چرائی تھی۔

تمام رشتہ داروں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ لیکن رضوانہ اور انور کا کہیں پتہ نہیں چلا ــــــ!

چار سال کا عرصہ گزرنے کے بعد ڈپلومہ حاصل کر کے احمد نے گھر واپس جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور پھر شاہ صاحب وغیرہ سے اجازت لے کر اپنے بچے اسحاق کی انگلی پکڑے وہ شاہ صاحب کی کوٹھی پر الوداعی نظر ڈالتا ہوا کوٹھی سے باہر آ گیا ــــ

رضوانہ کے والدین اور عباس کے علاوہ اس کے کچھ دوست (جو چار سالہ قیام کے دوران اس کے نزدیک آ گئے تھے) اُسے الوداع کہنے ریلوے اسٹیشن تک آئے۔

ٹرین کے روانہ ہونے سے قبل نانا اور نانی نے ننھے اسحاق کو بہت سا پیار کیا۔ اس کی نانی نے اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بٹوہ تھما دیا ــــــ اس بٹوہ میں اچھی خاصی رقم رکھی گئی تھی۔

احمد اپنے گھر پہنچا تو ڈپلومہ اس نے اپنے والد صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا اور ننھے اسحاق کو رضیہ کے سپرد کر کے خود فرطِ محبت میں اپنی بوڑھی ماں سے بغل گیر ہو گیا ــــــ "یہ بچہ... کس کا ہے بیٹے۔؟" ماں نے فرطِ حیرت سے معصوم بچے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ــــــ "یہ سب اس ذات کی کرامت ہے امی۔! بس ایک بات کا آپ اور رضیہ کو یقین دلاتا ہوں کہ... میں نے رضیہ کی حق تلفی نہیں کی ہے... بس اتنا جان لو کہ خدائے برحق کو رضیہ کی حالت پر رحم آ گیا اور رضیہ کو یہ چاند سا بیٹا عنایت فرما دیا۔" بیٹے کی بات سن کر بوڑھی ماں کے دل میں ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے اس نے بچہ کو بہو کی گود سے لے کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور بے تحاشہ اسے پیار کرنا شروع کر دیا... وہ والہانہ انداز میں اس کی بلائیں لینے لگیں۔ دوسری طرف رضیہ کی خوشیوں کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ اس قدر خوش تھی ننھے اسحاق کو پا کر جیسے اس کا اپنا ہی بچہ ہو۔ جیسے اسحاق کو اسی نے جنم دیا ہو ــــ

سودا

شیلا جان دے رہی تھی، سب کے چہرے اداس اور حسرت و یاس سے لبریز کبھی فرش پر پڑی بے ہوش شیلا کے متوازن بدن کو دیکھتے یا سرد آہ کھینچے ایک دوسرے چہروں پر اپنی پریشان نظریں مرکوز کرتے۔

سارا سماں بے حد تکلیف دہ اور پژمردہ لگ رہا تھا۔ آخر ہزار ہا دلوں کے ساتھ کھیلنے والی دل ربا اور ساری بستی کی رونق اس جوانی کے عالم میں سارے بندھن توڑ کر دم توڑ رہی تھی۔

بمشکل شیلا نے آخری بار بوجھل آنکھیں واکیں اور ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ نہ جانے بھیڑ میں سے کون پانی سے بھرا گلاس لایا اور اس کے حلق میں چند قطرے ٹپکا دیے۔

شیلا نے آس پاس کا بغور جائزہ لیا۔ اور دفعتاً بند مٹھی اشوک کی جانب دراز کر کے اس کے دائیں ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر ساتھ ہی آخری ہچکی لی —— اور اس دار فانی کو سدا کے لیے الوداع کہہ گئی۔

شیلا کا اس طرح اچانک و بے سبب دم توڑنا ہر ایک کے لیے معمہ سے کم نہ تھا۔ البتہ اشوک بت بنا کھڑا رہا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں یک لخت آنسو سمٹ آئے۔

درگا بائی نے معاملہ رفع دفع کرنے اور کوٹھے کے افسردہ ماحول کو جلد از جلد رونق بخشنے کی تیاریاں شروع کیں، ایک جانب شیلا کی آخری رسم شرعت کے ساتھ ادا کرائی گئی اور دوسری جانب خوب صورت آواز و دلکش جسموں کے پرستار اپنی تلخیوں کو مٹانے کی غرض سے کوٹھے آباد کر گئے۔

اشوک ان سب لوازمات سے بے نیاز مرے مرے قدموں سے گھر کی جانب چل پڑا۔ جیسے اس کی تمام کی تمام خواہشات جام شہادت نوش کر گئی ہوں۔

گھر میں داخل ہو کر ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ اپنی مٹھی میں بند کاغذ کے پرزے کو کھولا نفس مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

مشفق اشوک

مجھے اجازت دو کہ میں پھر ایک بار تم کو بھائی کہہ کر پکاروں، جس طرح اس بستی میں قدم رکھنے سے قبل کہا کرتی تھی۔

شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ مگر میں نے تمہیں ایک ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔

یاد کرو کوئی پندرہ برس گزر گئے جب کہ ہمارے ماتا پتا یکے بعد دیگرے مہلک بیماری کا شکار بنے اس سنسار سے سدا کے لیے اٹھ گئے تھے۔ اس وقت تمہاری عمر ۹ سال اور میں ۱۵ برس کی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ ہم دونوں کی حالت ایک کٹی پتنگ سے کم نہ تھی جو ہوا میں بے ارادہ و بے مقصد فنا ہونے کے لیے ہچکولے کھاتی پھرتی ہے۔

پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے میں نے گھر کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا۔ جب کچھ بھی قابل قدر اثاثہ نہ رہا تو میں نے اپنی اور تمہاری بدحالی کے پیش نظر سیٹھ جگن ناتھ کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ سیٹھ صاحب تو بذات خود بڑے نیک انسان تھے۔ لیکن ان کے بیٹے اُرمل دیو نہ جانے کیوں مجھ پر زیادہ مہربان ہونے لگے! مجھ پر دیکھتے ہی دیکھتے خلوص اور محبت کی بارش ہونے لگی ـــــ وہ مجھ میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگے ـــــ میں پہلے پہل کھچی کھچی رہنے لگی۔ اپنے آپ کو ہر طرح سے بچاتی رہی۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دن سارا طلسم ٹوٹ گیا۔

"شیلا ـــــ ایک بات کہوں ۔ ۔ ۔ ۔ تم مان جاؤ گی نا ـــــ؟"

"فرمائیے ـــــ آپ مالک ہیں مجھے آپ کی بات ماننے سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔؟" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

وہ قریب آتے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ اور میری بے بسی کا فائدہ اُٹھانے لگے! طرح طرح سے مجھے سبز باغ دکھانے لگے۔ انہوں نے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ اور ایک شام جب کہ بڑے سیٹھ شہر سے باہر چلے گئے تھے انہوں نے مجھے گھیر لیا۔

مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے آگے بڑھے، میں گھبرا گئی اور بھاگتی ہوئی دہلیز پر آگئی۔ لیکن وہ میرا پیچھا کرنے لگے اور پکڑ کر مجھے بازو والے کمرے میں لے گئے۔

"شیلا! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے، یقین کر لو ـــــ میں تمہاری خاطر دنیا کی ہر چیز ٹھکرانے کے لیے تیار ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے سے وابستہ کرنا چاہتا ہوں۔"

ان کی آواز محبت سے لبریز تھی۔ کپکپاتے ہونٹوں سے وہ اپنائیت کا اظہار کر رہے تھے میں کچھ بھی نہ کر سکی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے زمین سے آسمان پر اٹھانے کی کوشش میں مجھے دامِ فریب میں پھانس لیا۔ میں احتجاج بھی نہ کر سکی۔

"کیا تمہاری خاموشی رضامندی کی دلیل ہے ــــ؟"

انہوں نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

میں شرما گئی ــــ اور بمشکل تمام زبان کام کر گئی۔

"ایک نوکرانی کا مذاق اُڑانے سے آپ کو کیا حاصل ہو گا۔ میں کیا اور میری بساط کیا ۔۔۔۔؟"

"نہیں ــــ نہیں شیلا۔ میں مذاق سے کام نہیں لے رہا ہوں جس دن سے تم نے اپنے مبارک قدم اس گھر میں رکھے ہیں۔ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔ تمہاری نرگسی آنکھیں، سیاہ ریشمی زلفیں، اُٹھتا بیٹھتا چہرہ، سرو قد ــــ اور آواز میں عضب کا لوچ۔ تم میں کیا نہیں ہے۔ تم ہنستی ہو تو موسم بہار کے پھول جیسے ہر سو کھل اُٹھتے ہوں ــــ تم ٹھہر جاتی ہو تو وقت کی نبضیں رک سی جاتی ہیں ــــ"

وہ امیر تھا ــــ اور میں ایک غریب و لاچار ــــ وہ آسودہ حال تھا۔ اور میں مفلوک الحال ــــ وہ آزاد اور میں مجبور ــــ آہ! ایک امیر سیٹھ کا اکلوتا بیٹا میرے لیے بے چین تھا ــــ اس نے کچھ اس اپنائیت بھرے انداز سے اپنی محبت کا یقین دلایا کہ میں لمحہ بہ لمحہ اس کی جانب کھنچنے لگی ــــ جیسے کٹی پتنگ کی ڈور دفعتاً کسی کے ہاتھ میں آگئی ہو۔

میرے دل میں خیال اُبھرا۔۔۔ کہ ایک امیر باپ کا بیٹا میرے لیے بے چین ہے۔ اس کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ اور میں نے اس کا دل نہیں توڑا۔ ــــ ارمل دیو کی امارت و محبت نے مجھے زیر کر ہی دیا۔

مجھے اس کی مہربانیاں حاصل ہوئیں اور ایک عالی شان گھر رہنے کو ملا۔ میرے ارمانوں کے لال! ان دنوں مجھے تم سے نفرت ہونے لگی تھی۔ امارت کا دیوتا جو مجھ پر مہربان تھے، میں تمہاری نسبت اپنے فرائض ایک ایک کر کے فراموش کرتی گئی ــــ تم پر کفا جفا کی بارش ہونے لگی۔

میں چاہتی تھی کہ تمہیں اپنے سے الگ کر دوں —— تمہیں بھول جاؤں۔
ارمل کی محبت میں سرشار میں نے تمہیں اپنے سے الگ کرنے کی بابت اقدام اُٹھائے اور ایک روز میرے غیر متوقع رویہ سے تنگ آکر تم کہیں چلے گئے۔
مجھے اطمینان سا حاصل ہوا، کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے خوشگوار لمحات میں تمہارا خیال بسیرا کر کے مجھے بے چین کر دے۔
کچھ دنوں کے بعد میں نے سنا کہ فٹ پاتھ پر تم بوٹ پالش کرتے ہو۔ اور کوئی شخص رحم کھا کر تمہیں کسی دوسرے شہر لے گیا ہے۔
یہ جان کر میں بہت خوش ہوئی کیوں کہ تمہارے چلے جاتے سے میں نے اپنے آپ کو آزاد پالیا۔ اب میں اکیلی تھی۔ اور ارمل میری کشتیِ حیات کا ناخدا بنا ہوا تھا ——
برابر ارمل تین سال تک میرے جسم سے کھیلتا رہا اور میری نسوں میں بسی حرارت و چاشنی چوستا رہا۔ شراب کی محفل سجاتے اور مانع حمل گولیاں کھانے کی میں عادی بن گئی۔ اور جب ارمل اعلیٰ ٹریننگ حاصل کرنے کی غرض سے بمبئی چلا گیا ——
میں باوجود احتیاط برتنے کے ماں بننے والی تھی۔ ارمل نے مجھے دلاسہ دیا۔ لیکن اس کے چلے جاتے کے بعد سیٹھ اور سیٹھانی پر میری حالت آشکار ہوگئی اور پھر مجھ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیٹھ جی برس پڑے۔
"کیوں چڑیل! کس سے منہ کالا کر کے آئی ہو۔۔
تو آخر نیچ ہے نا! جو ہمارے خاندان کی عزت پر دھبہ لگانے سے بھی نہیں ہچکچائی ——"
میں نے ایمانداری سے اصل حقیقت کا انکشاف کیا کر دیا کہ مجھے بنگلہ سے ہی نکال دیا گیا اور میری داد رسی کسی نے بھی نہیں سنی۔ راجو کاکا نے میری وکالت کی کوشش کی تھی لیکن بدلے میں وہ بھی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب

کون تھا جو مجھے پناہ دیتا ــــــ؟
نیچے دھرتی ــــ اُوپر آکاش ۔ ۔ ۔ اور ان دونوں کے درمیان
گِھرا ہوا میرا پاپی وجود ــــ سماج کی سب سے بھیانک مجرمہ ۔
قسمت آزمائی کے لیے میں اپنے محبوب کے پاس چلی گئی ۔ مجھے پورا
یقین تھا کہ اس آڑے وقت میں میری دستگیری کرنے میں پیش پیش رہیں گے
لیکن بھیا ــــ ! کیا بتاؤں کہ ارمل نے مجھے دیکھتے ہی نفرت سے آنکھیں پھیر
لیں اور کہنے لگا ۔

"میں تم کو نہیں پہچانتا ۔ ۔ ۔ تم کون ہو ــــ کہاں سے آئی ہو،
میں تو کسی شیلا کو جانتا ہی نہیں ۔ کیوں عزت اچھالنے کی کوشش کر رہی ہو
میں تمہاری سازش کو پاش پاش کر دوں گا ۔"

ان الفاظ نے جیسے ناسور پر نشتر زنی کا کام کیا ۔ میں اور میرا وجود ایک ساتھ
ہی ڈگمگانے لگے ۔ میں زمین پر گرنے ہی والی تھی کہ ارمل کے یہ الفاظ کانوں میں گونجے
"تم یہاں سے چلی جاؤ ــــ ورنہ ۔ ۔ ۔ پولیس کو خبر کر دوں گا ۔
ــــ بھکارن کہیں کی ۔"

یہ کہہ کر ارمل نے میرے سامنے ایک اٹھنی پھینک دی اور چلا گیا ۔
میں اپنی تقدیر کو کوستی رہی ــــ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی ۔
میں دریا کی جانب چلنے لگی ۔ ارادہ خودکشی کا تھا ۔ اب موت کی گود میں ہی مجھے
آرام مل سکتا تھا ۔
پُل کے قریب خانہ بدوشوں کی ایک ٹولی جا رہی تھی ۔ میری ابتر حالت
بھانپ کے ٹولی کے سردار نے مجھ سے پوچھا ۔
"کیوں بیٹی ــــ کیا بات ہے، کیوں رو رہی ہو ــــ؟"
میں ترس رہی تھی کہ کوئی مجھے بیٹی کہہ کر پکارے ۔ میرا دل شدّتِ جذبات
سے بھر آیا ۔ آج پہلی بار پتاجی کے مرنے کے بعد کسی نے مجھے بیٹی کہہ کر پکارا تھا ۔

آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان ساری داستان سردار کو سنا ڈالی۔
بدلے میں اس نے مجھے تسلّی دی اور اطمینان دلایا ـــــ اور اپنی منڈلی کا
فرد بنالیا ـــ

ہم نے شہر کا رُخ کیا۔ اسی دوران میں نے ایک خوب صورت سے بچے کو جنم دیا۔
اب میں خانہ بدوشوں کی ٹولی کے ساتھ مل کر ناچنے گانے لگی ۔۔۔ ۔ میرے
دل میں سردار چاچا کے لیے اتنی عزت اور محبت پیدا ہوگئی تھی جتنی مجھے اپنے پتاجی سے تھی۔
میں نے اپنی زندگی کے سابقہ دنوں کی یاد کو اپنے دل سے فراموش کر دیا تھا۔
اور اس نئی دنیا میں پوری تندہی کے ساتھ دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اب ایک معصوم
بچہ میری ویران زندگی کا واحد سہارا تھا۔
لیکن ـــــ بھگوان کو میری یہ خوشیاں ایک آنکھ نہ بھائیں اور ایک
روز جب کہ ہماری ٹولی لکھنؤ سے الہ آباد جارہی تھی ـــــ راستے میں ہماری ریل دوسری
ریل سے جا ٹکرائی۔ میں اور سردار کی بیٹی رجنی مشکل سے بچ سکیں اور منا مع سردار اور
دوسرے ساتھیوں کے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔

میں ایک بار پھر سے اس دنیا میں بے آسرا ہوگئی ۔۔۔ ۔ بڑی دشواریوں
کے بعد میں اور رجنی الہ آباد پہنچ گئیں۔ جہاں ہماری ملاقات ایک اور سیٹھ چندر کانت
سے ہوئی۔ جب انہیں علم ہوا کہ رجنی اور میں ناچنے گانے میں ماہر ہیں تو اس نے
بہت خوشی کا اظہار کیا اور کچھ دنوں کے بعد ہماری حالت سدھار نے وہ ہمیں بمبئی
لے آئے ـ'

ہم دونوں سیٹھ چندر کانت کی خواہش کے مطابق تھیٹروں میں اپنے جسموں
کی نمائش کرنے لگیں ۔۔۔ ۔ خوب کمایا ـــ خوب گنوایا ـــ
نہ جانے سیٹھ چندر کانت کو کیا سوجھی کہ وہ مجھ سے اظہار محبت کر بیٹھے
اور اپنی بے لوث محبت کا دم بھرنے لگے۔ گو میں ان کے لیے ایک بیٹی کے ہمسر تھی
جب میں نے انکار سے کام لیا تو انہوں نے میرا کنٹریکٹ ہی منسوخ کر دیا

میرے ساتھ ساتھ رجنی کو بھی کمپنی کو خیر باد کہنا پڑا ۔

شراب پینے کی بُری عادت نے ہم دونوں کو اپنی زد میں لے لیا تھا جس کے سبب ناچنے گانے سے بچائی گئی رقم زیادہ دنوں تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکی ۔

ہم دونوں سوچ ہی رہی تھیں کہ اب کیا کریں کہ اچانک ایک روز ایک شخص یوسف تارا سے ہماری ملاقات ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قد آور ـــ اُسے لوگ قطبِ مینار کے نام سے یاد کیا کرتے تھے ۔

"سنا ہے کہ آپ دونوں نے سیٹھ چندر کانت کی کمپنی میں کام کرنا چھوڑ دیا ہے ؟" ـــ "جی ہاں ـــ آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے ۔" ہم دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا ۔

"اگر آپ کو کام کرنے کی خواہش ہو تو ہماری کمپنی کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں ۔"

"آپ کی کمپنی کا کیا نام ہے ۔ ـــ ؟"

رجنی نے فوراً ہی اُن سے دریافت کیا ۔

"انڈین ڈ تھیٹر ـــ اور میں خود اس کمپنی کا مالک ہوں ۔"

ہم سمجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھگوان کو ہماری حالت پر ایک بار پھر رحم آگیا ـــ جو یوسف تارا نے دست اعانت دراز کیا ہے ۔

اگلے روز ہم دونوں یوسف تارا کے ساتھ اس کے تھیٹر میں چلے گئے ۔

انڈین ڈ تھیٹر کی دنیا ہی الگ تھی ۔ یہاں تھیٹروں میں ہزاروں لوگوں کو ناچ گانے کے ذریعہ خوش کرنا پڑتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں اس کمپنی کے کچھ معزز حضرات کا دل خوش کرنے کے لیے جسم کی نمائش بھی کرنی پڑتی تھی ۔

رات دن شراب اور کباب کے دور چلتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے اس گندے ماحول سے نکلنے کی کوشش کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن کامیابی نہیں ملی اور مجبور ولاچار ہمیں حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا ۔

کسی نہ کسی کا دل بہلانے کے لیے ساری ساری رات اس کی شرکت میں گزارنی پڑتی ـــــ

وقت اور حالات نے ہم سے وہ سب کچھ کرایا جس کے تصور سے بھی ہم کانپ جاتے تھے ۔

کل اچانک تمہارا اس تھیٹر نما چکلہ میں گزر ہوا ۔ پہلی ہی نظر میں تم کو پہچان گئی ـــــ دل میں خیال آیا ـــــ شاید تم میرے بھائی نہیں ہو سکتے اسی لیے میں نے رجنی کے ذریعہ باتوں باتوں میں تمہاری زندگی کے گئے گزرے حالات دریافت کرائے ۔

ایک ایک پیگ حلق میں انڈیلتے تم بہت کچھ کہہ گئے اور میرے دل پر آرے چلتے گئے ـــــ ارمانوں کا خون ہوتا رہا ـــــ تم ایک ایک واقعہ دہراتے تھے تو مجھ پر بجلیاں گرتی تھیں ۔

یہ سن کر دل کو بہت اطمینان ہوا کہ کسی بھلے آدمی نے تمہیں بیٹے کا درجہ بخش دیا ہے ۔ میں نے رجنی کے ذریعہ تمہیں آج یہاں آنے کے لیے کہلوایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ میں اپنی دکھ بھری کہانی کاغذ کے پرزے پر لکھ کر تم تک پہنچا سکوں ۔

میرے بھائی ـــــ میں نے زمانے میں ٹھوکریں کھانے کے لیے تمہیں اپنے سے الگ کر دیا ـــــ فقط اپنے مقصد کی خاطر ـــــ ہاں ہاں! اپنی خود غرضی کے ناطے تمہیں اپنے سے جدا کر دیا ۔

اب جب کہ میں ـــــ چند ساعتوں کی مہمان ہوں ـــــ تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے معاف کر دینا ـــــ میں تمہاری بہت بڑی گناہ گار ہوں! گو کہ میرے گناہ معاف کرنے کے قابل نہیں ـــ

ساتھ ہی ساتھ اگر ممکن ہو تو آج کے بعد اس نگری کے ہرگز چکر نہ لگانا ـــــ یہ بازارِ حسن باہر سے بہت ہی دل فریب اور دلکش لگتا ہے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در حقیقت اس بازار کی گلیوں میں ماں کی ممتا، بہن کے پیار

اور بھائی کے وچن کا مول تول ہوا کرتا ہے ۔
ایک پرارتھنا اور ہے ۔۔۔۔۔۔ اگر ہو سکے تو رجنی کو بھی اس گندی
بستی سے چھٹکارا دلا دینا ۔۔۔۔۔ اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے ۔
تمہاری بد نصیب بہن
شیلا ——"

خط پڑھ کر اشوک کی حالت ابتر سی بن گئی۔ جیسے اسے کسی نے کھولتے
ہوتے پانی میں ڈال دیا ہو —— بالکونی میں گھس کر وہ بچوں کی طرح بلک بلک
کر رونے لگا —— آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں میں اُمنڈ آیا ۔
اگلے روز اس نے شمشان گھاٹ سے بہن کی چتا کے پھول چن لیے اور
انہیں پوتر گنگا کی لہروں کے سپرد کر دیا ۔

اور پھر ——
بہن کی آخری خواہش کے مطابق اس نے محکمہ پولیس کی مدد سے رجنی
کو اس گندی بستی سے چھٹکارا دلانے میں کامیابی حاصل کر لی ۔
اتنا ہی نہیں
اشوک نے رجنی کی زندگی بنانے سنوارنے اور سجانے کی غرض سے
اس کے ساتھ شادی کر لی ۔
ایسا کرنے سے اشوک کے دل میں ایک عجیب طرح کی خوشی نے
جنم لیا ۔ اُسے لگا جیسے اس کی بہن شیلا کی روح اُسے اور رجنی کو آشیر
واد دے رہی ہو ——

عشق کی عظمت

تقریباً دو ماہ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں قیام کرنے اور مشہور ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرتے کے بعد بھی سیٹھ ارل چند کی پتنی الورادھا کو مکمل طور پر افاقہ نہ ہوا۔ طرح طرح کے ٹیسٹ لیے گئے۔ ڈاکٹر لگاتار دوائیاں وانجکشن بدلتے گئے لیکن چھاتی میں میٹھا میٹھا درد اب بھی رہ رہ کے اُٹھتا تھا۔ اپنی جانب سے سیٹھ صاحب نے علاج کرانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔

انسٹی ٹیوٹ سے نکل جانے سے قبل سیٹھ صاحب نے ڈاکٹر پرشاد سے رابطہ کیا۔ جس نے رائے دی کہ کسی صحت افزا مقام پر کچھ مدت کے لیے قیام کرنے پر سیٹھانی صاحبہ مکمل طور پر صحت یاب ہو سکتی ہیں۔

سیٹھ صاحب کی اپنی ایک کوٹھی شملہ میں تھی۔ وقت ضائع کیے بغیر انہوں نے اپنی پتنی کو ڈاکٹر پرشاد کے مشورے کے تحت اپنے گھریلو ملازم کالو

سنگھ کے ہمراہ شملہ بھیجنے کے انتظامات مکمل کر دیے۔

انورادھا نے مالتی سے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا ــــ ویسے مالتی کے بغیر انورادھا کی زندگی ادھوری تھی ــ وہ مشکل سے چھے سال کی تھی جب مالتی کو رگھوناتھ مندر کی سیڑھیوں پر سے اُٹھایا تھا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی اس کے ماں باپ کا پتہ نہ چلا۔ سیٹھ صاحب اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ کالو سنگھ نے مالتی کو اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا۔

اب مالتی کی عمر بیس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ تقریباً بارہ سال سے مالتی انورادھا کی خدمت کرتی آئی تھی۔ شہد کی مکھی کی طرح ــــ سیٹھانی کو صبح سے شام تک کھانے پینے اور پہننے کو کیا چاہیے اور کس وقت چاہیے سیٹھانی سے متعلق کسی اور سے زیادہ خود مالتی جانتی تھی۔ سیٹھانی کی اپنی کوئی بیٹی نہ تھی، بس ایک لڑکا پرکاش تھا۔ جس نے ڈاکٹری سند حاصل کر لی تھی اور آنکھوں سے متعلق مزید ٹریننگ اور تربیت حاصل کرنے کی غرض سے وہ جرمنی چلا گیا تھا ....

.... یہی وجہ تھی کہ انورادھا مالتی کو بہت زیادہ چاہتی تھی ــــ مالتی نے اس سارے عرصہ میں ایک بار بھی سیٹھانی کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔

کالو سنگھ اور مالتی کے ساتھ شملہ کے بنگلہ میں قیام کرنا سیٹھانی صاحبہ کو بہت اچھا لگا۔ موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ اور کھلی فضا میں سانس لینے سے انہیں بڑی حد تک آرام حاصل ہوا ــــ کہاں بمبئی کی پُر ہنگام زندگی ــــ اور کہاں شملہ کے قدرتی نظاروں سے معمور فضا۔

صبح سویرے مندر سے واپسی پر حسبِ معمول گھریلو کام میں مالتی جُٹ گئی۔ سیٹھانی کا منہ ہاتھ دھلایا ــــ دودھ گرم کر کے دیا۔ اور ڈبل روٹی کے پیس پر جیم لگا کر سامنے رکھے۔ کام سے فارغ ہو کر اسٹور روم سے ملحق پچھواڑے کی جانب سے کھلنے والی کھڑکی پہلی بار کھول دی۔ سامنے والے مکان کے کھلے دالان میں کرسی پر براجمان ایک نوجوان سے مالتی کی نظریں جا ٹکرائیں۔

نوجوان خوش پوش تھا اور برابر مالتی کو گھورے جا رہا تھا۔ بدلے میں مالتی بھی ہر چیز سے بے نیاز غیر ارادی طور پر اسی نوجوان کو دیکھنے میں محو ہو گئی۔

اس کی رگ رگ میں ایک غیر معمولی ارتعاش پیدا ہونے لگا۔۔۔۔ دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتے لگی۔ وہ نہ جانے کب تک اس نوجوان کو دیکھتی رہتی اگر سیٹھانی صاحبہ کا بلاوا نہ آتا۔

اب مالتی کا روز کا معمول بن گیا کہ صبح و شام کھڑکی کی منڈیر کے سہارے ٹیک لگائے اس اجنبی نوجوان کے انتظار میں وقت گزارنے لگی ـــــ اکثر نوجوان آرام کرسی پر براجمان نظر آتا۔ یا پھر اندر سے نکل کر دالان میں مٹر گشت کرتا۔ اور ادھر ادھر جھانکنے میں مشغول ہوتا۔ برابر ٹکٹکی باندھے وہ ایک دوسرے کو دیکھا کرتے ـــــ مالتی حسب عادت کھڑکی کے پٹ کھولے کھڑی تھی کہ اچانک ایک چھوٹی سی لڑکی ہاتھ میں پلیٹ لیے نوجوان کے پاس آئی۔ اور پلیٹ کو اس کے ہاتھ میں تھما دیا ـــــ اسی دوران لڑکی نے مالتی کو دیکھا۔ پھر نوجوان مالتی کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے چھوٹی لڑکی نے نوجوان کو مالتی کی موجودگی کا احساس دلایا ہو۔ وہ چمچے کے سہارے پلیٹ سے کچھ کھانے میں محو تھا۔ مگر نظریں برابر مالتی کو نشانہ بنائے ہوئے تھیں۔

اتنے میں وہی گڑیا قسم کی لڑکی باغیچے میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی خاطر نیچے آگئی ـــــ مالتی اور نوجوان بس ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

سر شام مالتی نے دیکھا کہ وہی لڑکی اس کے بنگلہ کے پاس سے گزر رہی ہے۔ مالتی بڑی سرعت کے ساتھ سیڑھیاں عبور کرتی ہوئی اس لڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ اور اس لڑکی سے رابطہ قائم کرنے پر مالتی یہ جاننے میں کامیاب ہو گئی کہ نوجوان لڑکی کا بڑا بھائی سریش کمار ہے۔ جو اپنی ماں اور دو بہنوں کے ساتھ اس بنگلہ میں قیام پذیر ہے۔ لڑکی کا نام رانی ہے۔ اور ان کے پتا جی نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میجر کی حیثیت سے سیالکوٹ سیکٹر میں ملک و قوم کی سلامتی کی حفاظت کرتے ہوئے

اپنی جان قربان کر دی تھی۔

مالتی نے مناسب نہیں جانا کہ رانی سے مزید کچھ دریافت کرے۔ وہ جلدی جلدی رسوئی میں جا کر پکانے کے لیے کالو چاچا کی لائی سبزی وغیرہ صاف کرنے لگی۔

مالتی دل ہی دل میں سریش کو چاہنے لگی تھی۔ اب وہ کسی نہ کسی بہانے اسٹور روم جا کر پچھواڑے کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول کر سامنے والی کوٹھی کی طرف دیکھا کرتی ــــ جہاں عموماً سریش آرام کرسی پر نیم دراز رہتا تھا۔

ایک شام مالتی نے دیکھا کہ رانی اپنے بھائی سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہہ رہی ہے۔ اور پھر اپنا نازک سا ہاتھ اٹھا کر رانی نے مالتی کی طرف اشارہ کیا ــــ سریش اسے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔

محبت کے جذبے میں سرشار مالتی کو اب اپنی سُدھ بدھ نہ رہی۔ اس کی پریشان زلفیں اس کے شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ اس کی حالت غیر نظر آ رہی تھی۔ اس کی بدلی ہوئی کیفیت سیٹھانی صاحبہ سے نہ چھُپ سکی۔ اور ایک روز سیٹھانی صاحبہ اسٹور روم میں دبے قدموں داخل ہوئیں ــــ اور مالتی کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

" مالتی ــــ ! میں نے تمہیں ایک بیٹی کا درجہ دیا ہے ــــ اور ایک ماں کی حیثیت سے تمہیں چاہا ہے اور ــــ تمہاری پرورش کی ہے، میں اُمید کروں گی کہ تم کوئی ایسا قدم ہرگز نہیں اُٹھاؤ گی۔ جس کی وجہ سے ہمارے نام پر کسی قسم کا بٹہ لگنے کا اندیشہ ہو۔"

مالتی کو اس احساس نے ڈس لیا کہ سیٹھانی صاحبہ پر سارا راز فاش ہو چکا ہے۔ وہ جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ اب وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ اب اُس میں سیٹھانی صاحبہ سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہیں تھی وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔

لیکن وہ کرتی بھی کیا ـــــ وہ تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکی تھی۔
اب تو سریش کی محبت اس کی نس نس میں سرایت کر چکی تھی۔ ورا سے دیکھے
بنا اس کے بے قرار دل کو قرار نہیں آتا تھا۔ ـــــ اب وہ زندگی کے اس
موڑ پر ایستادہ تھی۔ جہاں اسے سہارا دینے والا کوئی نہیں تھا۔

گزرے ایام کی طرح مالتی نے سیٹھانی اور کالو چاچا سے نظریں چرا چرا
کے اپنے من مندر میں بسیرا کرنے والے دیوتا کے درشن کرنے کے لیے کھڑکی
کے پٹ کھول دیے! ... ۔ لیکن اس بار خلاف معمول دالان میں پڑی
کرسی خالی نظر آئی۔ اگلے روز بھی ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح مسلسل کئی روز گزر گئے لیکن سریش کے درشن نہیں ہوتے!
مالتی اندر ہی اندر جلنے اور کڑھنے لگی۔

درد و کوفت کے ملے جلے اثرات اس کی رگ و پا میں واضح انداز میں
پھوٹنے لگے۔ اب گھر کا کام کرنے میں قطعی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ ہر وقت
غمزدہ اور کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔

پہلے تو مالتی کے دل میں یہ خیال گزرا کہ ہو نہ ہو سیٹھانی صاحبہ نے
سریش کی ماں کے ساتھ بات کی ہوگی جس کے باعث سریش نے دالان میں آنا
ترک کر دیا ہے ـــــ لیکن ایک روز شام کے وقت ایک ڈاکٹر سریش کے
گھر سے نکلتے دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گئی کہ یقیناً سریش کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

مایوسی اور اداسی کی ملی جلی تصویر بنی موقع ملتے ہی اس کے قدم سامنے سریش
کی کوٹھی کی جانب اُٹھنے لگے۔ صحن جلدی جلدی عبور کر کے سامنے کا دروازہ کھولا۔
اس کی نظر سامنے بچھے ہوتے پلنگ پر مرکوز ہو گئی۔ پلنگ پر سریش کمار دراز تھا۔
فرطِ جذبات میں ڈوبی ہوئی مالتی آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھنے لگی۔
اور ـــــ اس کے سرہانے جا کر کھڑی ہو گئی۔

سریش کی آنکھیں کھلی تھیں ـــــ وہ برابر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس سے قبل کہ مالتی سلسلہ گفتگو کا آغاز کرتی اس کی ماں اور رانی بغل والے کمرے سے نمودار ہو گئیں۔

"سناؤ بیٹی —— ! کیسے آنا ہوا ؟"

"کون ہے ماں —— ؟" سریش نے پوچھا۔

"بھیّا ! یہ سامنے والی کوٹھی میں رہتی ہیں —— مالتی دیدی۔"

ماں کے بجائے رانی بلا سوچے سمجھے جواب دینے لگی اور مالتی بدلے میں اسے گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگی۔

" اوہ —— وہ ہیں ۔۔۔۔۔ ماں انہیں بٹھائیے ۔ا"

مالتی شرم وحیا کی تصویر بنی سریش کی بیماری کی بابت ماں سے پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی ۔۔۔۔ وہ صرف آنکھوں کی زبان سے باتیں کرنے لگی۔

"بیٹی سریش کو کچھ دنوں سے بخار آ رہا ہے —— یہ میرے اکلوتے بیٹے ہیں ۔ پرماتما نے ایک ، جاد ۔۔۔ ترمیں ، ان کی آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے ۔"

مالتی کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ اور بِلا کوئی بات کہے وہاں سے چل دی۔ جیسے وہ اپنی طاقت گویائی کھو چکی ہو۔

"کیوں ماں ! مالتی دیوی روتی کیوں تھی —— ؟" سریش نے اپنی ماں سے پوچھا —— ماں نے کہا

"بیٹے ! آپ کی آنکھوں کی نسبت سن کر بے چاری برداشت نہ کر سکی ! کتنی اچھی لڑکی ہے۔ جس گھر میں جائے گی اسے سورگ بنا دے گی"۔

اُدھر پردیس میں ماتاجی کی علالت کی اطلاع پاکر پرکاش غمگین رہنے لگا۔ ماں سے ملنے اور بیماری کی تفصیل جاننے کی خاطر پرکاش چھٹی لے کر چلا آیا ! پتاجی کے پاس رات بھر قیام کرنے کے بعد وہ سیدھا ہوائی جہاز کے ذریعہ

شملہ آیا۔

اُسی شام کھانا کھانے کے بعد جب مالتی سیٹھانی کے لیے گرم دودھ لے کر اس کے کمرے کی طرف جا رہی تھی، تو ملی جلی آوازوں نے اس کے کانوں کے پردے ہلا دیے۔

"نہیں بیٹے ——! میں نے بخوبی اندازہ لگایا ہے کہ مالتی کے ہاتھ اب بہت جلد پیلے کرنے ہوں گے۔ ورنہ بھگوان جانے آئندہ کیا کچھ کس انداز سے دیکھنا پڑے گا۔"

مالتی اس سے آگے کچھ نہ سن سکی اور جلدی سے باورچی خانے میں جا کر بلک بلک کر رونے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا پڑ گیا تو ——پرکاش کے پاس جا کر پوچھنے لگی۔

"بھائی صاحب ——! میں نے آپ کی اور ماں جی کی باتیں سن لی ہیں۔" —— "ہاں مالتی —— ماں جی چاہتی ہیں کہ جلد ہی تمہاری شادی کر دی جائے۔ لیکن اس میں رونے کی کیا بات ہے پگلی ——؟ ہر لڑکی جوان ہوتے پر شادی کی منزل طے کر کے اپنا گھر بساتے اپنے پیا کی نگری جایا کرتی ہے۔" پرکاش اس کی بات کاٹتے ہوئے کہہ گیا۔

مالتی نے پرکاش کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ پرکاش کا ہاتھ پکڑ کے اسے سامنے والی کوٹھی کی طرف لے گئی۔ نہ جانے یہ قوت و ہمت اس میں کہاں سے آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پرکاش کو سیدھا سریش کے پلنگ کے پاس لے جا کر مالتی کی زبان دل کی ترجمانی کرنے لگی۔

"بھیا —— میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں مانگا ہے۔ آج دامن پھیلائے یہ بھیک مانگتی ہوں۔ سریش بابو کی آنکھیں ٹھیک کر دیجیے اور میری ویران زندگی میں رنگ و نور بھر دیجیے۔"

پرکاش نے ماں جی سے حادثہ کی بابت تفاصیل حاصل کرکے سریش کی آنکھوں کا سرسری انداز میں معائنہ کیا۔ اور اگلے روز سریش کو مقامی ہسپتال میں لے جاکر اس کی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ کچھ ٹیسٹ لے کر بمبئی سے کچھ ضروری دوائیاں اور آپریشن کے نازک آلات منگوائے اور پھر ہسپتال میں ڈاکٹر جگجیت سنگھ کی شرکت میں سریش کی آنکھوں کا آپریشن کیا گیا۔

سریش کی تیمار داری کرنے میں مالتی پیش پیش رہی۔ سریش کی ماں بھی اسے دل سے چاہنے لگی۔

آپریشن کامیاب رہا۔ ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد آنکھوں کی پٹی کھلنے پر ماں جی اور مالتی بھی موجود تھی۔ اور جب سریش نے یہ مژدہ جاں فزا سنایا کہ اُسے سب کچھ نظر آرہا ہے ——— تو مالتی بشاشت و خوشی کے مارے دوڑتی ہوئی سیدھے شیو مندر پہنچی، اور بھگوان کا شکر ادا کرکے کچھ رقم حسب منت مورتی کے چرنوں میں چڑھا آئی۔

سریش پوری طرح صحت یاب ہوکر گھر آگیا۔ اب وہ بدلا بدلا سا نظر آنے لگا۔ وہ شہسواری کرنے میں ماہر تھا۔ مقامی کلب میں ملازمت ملنے پر وہ زیادہ سے زیادہ وقت اب نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو گھوڑسواری سکھانے میں صرف کرتا۔

سریش کی ماں اور سیٹھانی صاحبہ نے سریش اور مالتی کی بات چیت شروع کردی۔ لیکن سریش مالتی کے احسانات کا بدلہ اس سے شادی کرکے نہیں چکانا چاہتا تھا۔

اس کی بینائی درست ہوتے ہی اس کے دیرینہ معاشقے اُبھر کر ایک بار پھر سامنے آگئے تھے۔

سریش کی نظر انتخاب پدمنی پر تھی۔ جو ایک لکھ پتی باپ کی بیٹی تھی۔ اور اس نے شہسواری سیکھنے کے لیے کلب میں نیا داخلہ لیا تھا۔ اب تو دن کے ساتھ ساتھ رات کا بیشتر حصہ بھی سریش پدمنی کے ساتھ گزارنے لگا۔

سریش کی لے رخی دیکھ کر مالتی کے نازک سے دل کو بہت گہری چوٹ لگی۔ اس کے من مندر کے دیوتا نے جس کی وہ آج تک پوجا کرتی آئی تھی اُسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

اس کے تن من میں آگ لگ گئی۔ جس بات کو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اُسے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑ رہا تھا —— وہ یاسیت کی تصویر بن گئی۔ مالتی یہ صدمہ برداشت نہ کر پائی اور اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ گرنے لگی۔

پرکاش سے مالتی کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ سریش سے مل کر اس نے مالتی کی خوشیوں کی بھیک مانگی۔

لیکن سریش نے اس کی ایک نہ سُنی۔ اس کے حواس پر تو بُری طرح سے پدمنی کی محبت کا بھوت سوار ہو چکا تھا —— سریش کی جانب سے کورا جواب پا کر اور مالتی کی قابلِ رحم حالت کے پیشِ نظر پرکاش نے اپنی ماتاجی کو بمبئی واپس چلنے کے لیے آمادہ کر لیا۔

اب پرکاش نے مالتی کے دل سے سریش کا خیال نکالنے کے لیے اسے سمجھانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ لیکن وہ پرکاش کی ہر بات سن کر خاموش ہی رہتی

اسی دوران سریش کی چھوٹی سی بہن رانی وقتاً فوقتاً مالتی سے ملنے آجاتی اور گھنٹوں مالتی کے ساتھ کھیلتی رہتی، کبھی کبھار وہ اپنی گڑیا کے کپڑے سلوانے مالتی کے پاس ہی آیا کرتی۔ وہ اسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔

ایک دن رانی نے باتوں ہی باتوں میں مالتی کو بتایا کہ اس کے بھیّا سریش کی منگنی پدمنی کے ساتھ طے ہو گئی ہے۔

رانی کی بات سے مالتی کے کلیجہ پر ایک زبردست گھونسا سا لگا۔ لیکن وہ بے چاری آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

کچھ ہی دن کے بعد منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام کے ساتھ ادا کی گئی۔

—— سریش کی ماں نے مالتی کے سب گھر والوں کو منگنی میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن سیٹھانی کے یہاں سے کوئی بھی اس تقریب میں شرکت کرنے نہیں گیا۔

مالتی نے زہر کا یہ گھونٹ بھی خاموشی کے ساتھ حلق سے اُتار لیا۔ وہ اپنی پھوٹی ہوئی تقدیر کو دن رات کوستی رہتی —— رات کو پہروں تکیے میں منہ چھپا کر اپنی بدنصیبی پر خون کے آنسو بہاتی رہتی ——

غم واندوہ کی تصویر بنی وہ ایک روز جاکر سیٹھانی صاحبہ کے قدموں پر گر پڑی ۔ اور گڑگڑا کر کہنے لگی ۔

" مجھے واپس بمبئی بھیج دیجیے ۔ میں اب یہاں مزید قیام نہیں کر سکتی ہوں ——"

"بیٹی —— فکر نہ کرو —— اُس بھگوان پر پورا بھروسہ رکھو ۔ —— بھگوان جانے —— تمہارے لیے کون سی خوشی زندگی کے کس موڑ پر انتظار کر رہی ہوگی ۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو ——" سیٹھانی صاحبہ نے روتی ہوئی مالتی کو کلیجے سے لگاکر دلاسہ دیا۔

جس روز مالتی سیٹھانی اور ڈاکٹر پرکاش کی شرکت میں شملہ سے واپس جانے کا پروگرام طے ہوا، اسی روز دوپہر کو کالو سنگھ نے خبر دی کہ سریش کمار کو حادثہ پیش آگیا ہے ۔

کالو سنگھ نے بتایا کہ سریش کمار صبح ہی صبح کسی فرنگی دوشیزہ کو گھوڑ سواری سکھا رہا تھا کہ اچانک گھوڑا بے قابو ہوگیا اور اسے ایک کھڈ میں گرا دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب وہ ہسپتال میں زیر علاج ہے ۔"

جیسے ہی مالتی نے یہ خبر سنی اس پر ایک بجلی سی گر پڑی ۔ اس کے حواس باختہ ہوگئے وہ قطعی غیر ارادی طور پر کسی سے کچھ کہے سنے بنا ہسپتال کی طرف دوڑنے لگی ۔ ۔ ۔ پرکاش اس کو بنگلہ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر اس کے ارادے کو بھانپ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا ۔

ہسپتال پہنچ کر دیکھا تو سریش کی حالت بہت ابتر تھی ــــ اس کے جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کنپٹی کے قریب کافی گہرا زخم آیا تھا اور سریش ابھی تک بے ہوش تھا۔

پرکاش نے ڈاکٹروں سے مل کر بہت زیادہ کوشش کی۔ لیکن اس کی آنکھوں کی روشنی بحال نہ ہو سکی ــــ ! سریش کے سامنے پھیلا ہوا اندھیرا اُجالے میں تبدیل نہ ہو سکا۔

یہ بات جنگل کی آگ کی طرح سارے علاقے میں پھیل گئی کہ سریش کی بینائی ایک بار پھر چلی گئی ہے۔ سب اپنے پرائے اور ملنے جلنے والے ایک ایک کر کے سریش کو دیکھنے آئے۔۔۔۔! لیکن سریش کی منگیتر پدمنی نے منہ پھیر لیا۔ وہ سریش کو دیکھنے بھی نہیں آئی۔

ان حالات میں پرکاش نے مالتی سے بمبئی چلنے کے لیے کہا کیوں کہ سیٹھانی صاحبہ بمبئی واپس جانے کے لیے اپنا سارا سامان باندھ کر تیار بیٹھی تھیں۔

"بھیّا ــــ ! بھگوان کے لیے مجھے یہیں چھوڑ دیجیے ــــ میری منزل یہی ہے ــــ میں اپنے دیوتا کے قدموں میں رہ کر زندگی کے باقی ماندہ ایام گزار دینا چاہتی ہوں ــــ"!

از راہ انسیت سریش کے صحت یاب ہونے تک سیٹھانی صاحبہ اور پرکاش نے بمبئی جانے کا فیصلہ ملتوی کر دیا۔

زخم ٹھیک ہوتے کے بعد سریش جب گھر واپس آیا تو ماں اور رانی کے علاوہ اگر کوئی شخصیت اس کے ساتھ تھی تو وہ مالتی تھی ــــ سریش کی منگیتر پدمنی نے تو اسے ہمیشہ کے لیے ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن محبت کی دیوی نے اسے گلے لگا لیا تھا۔ اور اس کی تیمار داری کرنے میں رات دن ایک کر دیے تھے

سریش کی من پسند منگیتر نے اس کی آنکھوں کی روشنی چلے جانے پر سریش کو اپنی نظروں سے گرا دیا تھا۔ لیکن مالتی نے دل کی آنکھیں روشن رکھیں۔

اور اس کی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر بے لوث محبت کو زندہ رکھنا اپنا فرض جان لیا۔

اپنی طرف سے مالتی پر کیے گئے ظلم جبر کو یاد کر کے سرلیش تڑپتا رہا۔ اسے اپنے کیے پر سخت پشیمانی تھی۔ اس نے مالتی کے پاؤں پکڑ لیے اور اس سے رو رو کر معافی مانگنے لگا ـــــــ اور مالتی نے شدت جذبات سے اسے گلے لگالیا۔

مالتی کی بے لوث محبت اور خدمت کے سامنے سب نے ہتھیار ڈال دیے۔ سیٹھانی صاحبہ اور پرکاش نے شادی کا جشن نہایت شاندار پیمانے پر منانے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔

شہر کے معزز حضرات کو اس شادی میں شرکت کے لیے خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ اور تو اور سیٹھ ارمل چند خاص طور اس شادی میں شرکت کے لیے بمبئی سے شملہ آگئے

سارا بنگلہ منور تھا خوشگوار ماحول میں شادی ہوئی اور وہی شملہ کا بنگلہ سیٹھانی کی سالہا سال کی خدمت کرنے کے صلے میں مالتی کو ملا۔

وفا کی صلیب

ہسپتال کے اسپیشل کمرہ نمبر ۱۱ میں سعیدہ اسٹول پر سر جھکائے اُداس اُداس بیٹھی ہے۔ یاسیت و غم کے نقوش اس کے چہرے پر صاف عیاں ہیں جیسے کسی نے اس کی ساری کی ساری بشاشت چھین لی ہو۔

پاس کی پلنگ پر مسعود بے ہوش پڑا ہے۔ بجلی کی تیز روشنی میں مسعود کا چہرہ سفید پٹیوں میں ملفوف عجب طور سے وحشت ناک لگ رہا تھا۔

سعیدہ کی گود میں ایک پھول سا خوب صورت بچہ سو رہا ہے۔ میٹھی اور پُرسکون نیند جس میں کسی طرح کا خلل نہیں ۔۔۔ ۔اور افراتفری نہیں ؛ اس کے برعکس سعیدہ کے دل میں لگتا ہے بے چینیوں کا ایک تلاطم برپا ہے۔ اور دماغ کی حالت ایک محشر سے کم نہیں ـــــــ اس کی زیست میں کوئی

اندوہ ناک انقلاب رونما ہوا ہے جس نے اس کی ہر خوشی اور ہر مسرت کو مسخ کر کے رکھ دیا ہو ۔۔۔!

سعیدہ نظریں اُٹھائے ایک بار پھر مسعود کے چہرے کا جائزہ لینے لگتی ہے ۔ اتنے میں دروازہ کھولتے ہوئے نرس کمرے میں داخل ہوئی ۔

" اب ان کی حالت کیسی ہے ۔۔۔ ؟"

سعیدہ پر اضطرابی کیفیت طاری تھی ۔ سلام کہے بنا ہی مسعود کی حالت پُوچھنے لگی ۔

" اوہو ۔۔۔۔ آپ رو رہی ہیں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یقین کیجیے ! مسعود صاحب جلد اچھے ہو جائیں گے ۔" نرس کے لہجہ میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔۔۔۔ سعیدہ ڈوپٹہ کے پلو سے آنسو پونچھنے لگتی ہے ۔

اس سے پہلے کہ وہ نرس سے اس حادثہ کی نسبت کچھ اور پوچھ لیتی مسعود کی کراہٹ نے دونوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ۔ سعیدہ سرعت کے ساتھ نزدیک جا کے مسعود کی ادھ کھلی آنکھوں میں گھورنے لگی اور نرس کلائی کی شہ رگ پکڑے نبض کی رفتار جانچنے لگی ۔۔۔

سعیدہ سے نہ رہا گیا اور پوچھنے لگی ۔۔۔ " ہوش میں آ گئے ہیں کیا؟"

" جی ہاں ۔۔۔۔ "

" نبض کیسی چل رہی ہے ۔۔۔ ؟"

" بہت ہی تسلی بخش ۔۔۔ " نرس نے کہا ۔

" اتنے میں مسعود آنکھیں کھول دیتا ہے ۔ نگاہیں آہستہ آہستہ کمرے کا طواف کرنے لگتی ہیں ۔ اور پھر سعیدہ اور نرس پر مرکوز ہو جاتی ہیں ۔ دونوں کو ایک جا دیکھے مسعود کی نیم وا آنکھوں میں اُداسی و کشمکش کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں، اور پھر اچانک کچھ کہے بنا بے ہوشی کے آثار پھر سے نمایاں ہو جاتے ہیں ۔

دونوں اسے تھام لیتی ہیں ۔

اس کے لب تھرکتے ہیں ۔ جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو ۔

" ر ۔ ۔ ۔ و ۔ ۔ ۔ ز ۔ ۔ ۔ " اتنا کہنے کے بعد مسعود کی حالت

پھر سے ابتر ہو چلی ۔

نرس نے ڈاکٹر ورما کو بلایا ، جنہوں نے کوئی انجکشن دینے کو کہا ۔

یہ سب دیکھ کر سعیدہ لرز اُٹھی ـــــ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں

کا سیلاب اُمنڈ آیا ۔

انجکشن کیئے نرس تشخیص چارٹ کا جائزہ لینے لگتی ہے ۔ بچے کو ساتھ والے

خالی پلنگ پر لٹائے کچھ جاننے کی ٹوہ میں سعیدہ نرس سے چارٹ لیتی ہے ، لکھا تھا ۔

" مسٹر مسعود اختر ڈی ، ایف ، او رات کے گیارہ بجے کے قریب سنٹرل کلب

سے واپسی پر بُری طرح نشے میں چور ہونے کے سبب گوپال چوک میں ایک کار سے

ٹکرا گئے ۔ اس کے سر اور کاندھے پر گہرے زخم آئے ہیں ۔ "

سعیدہ کا چہرہ مرجھانے لگتا ہے ۔ پریشانی کے آثار واضح انداز میں

اُبھرنے لگتے ہیں ۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے ـــــ نرس اسے

چپ کراتی ہے ۔ دلاسہ دیتی ہے ۔ نام سے واقفیت حاصل کر کے وہ دونوں ایک

دوسرے میں دلچسپی لینے لگتی ہیں ۔

روزی سوچتی ہے کہ ہو نہ ہو سعیدہ مسعود کی بہن ہو یا اور کوئی قریبی

رشتہ دار ـــــ اُس سے نہ رہا گیا ۔ اور اپنائیت کے لہجہ میں سعیدہ سے پوچھا ۔

" بہن ـــــ مجھے آپ سے ایک گونہ ہمدردی پیدا ہو گئی ہے ۔ "

" شکریہ ـــــ آپ کی ذرہ نوازی ہے ۔ " سعیدہ نے آگے کچھ

نہیں بتایا ۔ وہ برابر معاملہ ٹالتی رہی ۔

" مجھے اپنی بہن تصوّر کیجیے ۔ کم از کم اپنی حالت مجھ پر ظاہر کر دیجیے ۔ "

روزی اصلیت جاننے کے شوق میں کہہ گئی ۔

"کیا کریں گی آپ اس ٹریجڈی کو سن کر ــــ ؟"، سعیدہ نے اصلیت کو چھپانے کے انداز میں کہا۔

" شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں "، اب کے روزی برجستہ کہہ گئی۔

" مدد ــــ ؟ ایک کمزور جنس دوسری کمزور جنس کی کیا مدد کر سکتی ہے ؟" سعیدہ نے کہا۔

" سعیدہ بہن ! دل کا حال سنانے سے طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ میری چاہت ہے کہ آپ کے دکھ سکھ میں شریک ہو کے آپ کا مساعد بن سکوں۔۔۔۔ یقین کیجیے کہ آپ کے کسی کام آنے سے مجھے خوشی محسوس ہو گی "۔

غرض بے حد اصرار کرنے پر سعیدہ نے اپنی داستان سنانی شروع کر دی ؛۔

" مسعود صاحب میرے شوہر ہیں "۔

ــــ اتنا سننا تھا کہ روزی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کی حالت بہت ہی غیر ہو چلی ــــ مزید حالات جاننے کی غرض سے اپنی حالت سدھارتے ہوئے اس نے سعیدہ کی جانب دھیان سے دیکھا ــــ

"بہن ــــ ہماری شادی ہوئے ڈیڑھ برس کا عرصہ گزرا۔ پہلے چھے مہینے بڑی اچھی طرح گزرے ۔۔۔۔ ہم دونوں کھاتے پیتے گھرانوں میں پروان چڑھے۔ خوش حالی میں بیاہے گئے ــــ

مسعود روزانہ صبح دفتر جاتے اور واپس آنے پر کچھ نہ کچھ کھانے کی چیز ساتھ میں لاتے۔ کبھی کبھار سینما جاتے تو میری شرکت میں اتوار اور دیگر چھٹیوں کا بہت سا حصہ میری نذر کیا کرتے۔ یقین کیجیے کہ زندگی مزے سے کٹ رہی تھی۔ مگر اچانک وقت نے پلٹا کھایا ــــ ان کے معمول میں تفاوت آنے لگا۔ شادی کے چھے ماہ بعد وہ اپنی عادت و روایت سے ہٹنے لگے۔ شام کو گھر دیر سے آتے

اور مجھ میں دلچسپی لینے کے بجائے ان کا زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر یار دوستوں کی صحبت میں کٹنے لگا۔

کبھی کبھی رات گئے تک ڈرائنگ روم میں ان کے دوستوں کی دھما چوکڑی سے ایک شور مچا رہتا۔ مگر یہ حالت بھی زیادہ دیر تک نہ رہی ـــــ وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ اب تو رات کے دو دو بجے تک وہ گھر سے باہر رہنے لگے۔

آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ساری ساری رات گھر سے غائب رہنے لگے۔۔۔۔۔ کلب جانے لگے ۔۔۔۔! میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ زندگی کے ساغر میں ارتعاش سما گیا۔ زیست کی رعنائی ختم ہو گئی۔

میں کیا بتاؤں بہن! ان کی اس غیر متوقع روش نے مجھے کس بری طرح سے بے چین کر دیا ـــــ! راتیں آنکھوں میں کٹنے لگیں۔ مصیبتوں کے بادل آسمان زیست پر ہر سو چھانے لگے۔ کئی بار ان سے اس تبدیلی کی بابت پوچھنے کی کوشش کی ـــــ لیکن بے سود ـــــ!

رفتہ رفتہ انہوں نے شراب پینا شروع کیا ـــــ شادی کرتے وقت میرے تصور میں بھی نہیں آیا تھا کہ میرے سرتاج اس کڑے طور اور سرعت کے ساتھ بدل جائیں گے۔،،

اتنا کہہ کر آنچل میں منہ چھپائے سعیدہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی برگشتہ بختی پر رونے لگی ـــــ جیسے اس کی زندگی کا انمول خزانہ لٹ گیا ہو۔ وہ زار و قطار رونے لگی ـــــ اور جب تک اس نے آنسوؤں کا خزانہ لٹا دیا روزی کمرے سے چلی گئی تھی۔

روزی کی دنیا لٹ گئی۔۔۔۔! اس کا محبوب اسے دغا دے گیا وہ ہسپتال چھوڑ کر سامنے کے ہوسٹل کے فلیٹ میں گھس گئی اور دیوار پر لگے مسعود کے فوٹو کو گھورنے لگی۔۔۔۔ اور پھر آنکھوں کے حلقے خشک کیے آرام کرسی پر دراز ہو چپ چاپ لگی

۔۔۔۔۔۔"تو کیا وہ سب ۔۔۔۔قسمیں ۔۔۔۔وہ ایک ساتھ مرنے جینے کے ۔۔۔وعدے ۔سب کچھ جھوٹے تھے ۔۔۔۔ سب خواب تھا۔۔۔!"

اُف ۔۔۔! مسعود ۔۔۔۔۔ مجھے دھوکہ دیتا رہا اور میں ۔۔۔۔ میں بے خبر رہی ۔! اس کی زبان پر ۔۔۔۔ اعتبار کر کے میں نے اپنا سب کچھ اس سے وابستہ کر دیا ۔

مائی گاڈ ـــــ! میرا محبوب اور ۔۔۔شادی شدہ ۔۔۔۔اِتنا بڑا دھوکہ اس قدر دغابازی ۔۔۔۔!"

مسعود کی تصویر کو ہاتھوں میں لیے روزی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی ۔ آنسوؤں کے قطرے فریم کے منڈیر پر جمنے لگے ۔۔۔۔۔۔ دفعتاً جمع شدہ قطرے تالاب کی صورت اختیار کر گئے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے تالاب میں سراسیمگی سمانے لگی ۔ اس کے تحت الشعور میں ماضی کی یادیں آب و تاب کے ساتھ اُبھرنے لگیں ۔

اوبرائے ہوٹل ـــــ اور کرسمس کی رات ـــــ ہر طرف لوگوں کا ہجوم آرکسٹرا کی مدھم مدھم موسیقی فضا میں منڈلانے لگی ۔۔۔ شربت اور کافی کا دور چل رہا تھا ۔ آن کی آن میں کیبن کے پردے گرے ، جن کے عقب میں شراب ناب کے ساتھ ساتھ شباب کے مزے لوٹے جانے لگے ۔

مسعود کا لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے آنا اور ۔۔۔ روزی کو اپنی طرف کھینچ لینا ـــــ پھر بیرے سے مزید دو پیگ لانے کو کہنا ۔

"ڈارلنگ میرا ساتھ دے دو ! اوہ ! تم کتنی اچھی ہو ـــــ کتنی دلکش اور خوب صورت اس پروردگار نے دنیائے جہاں کی تمام رعنائیاں تمہارے چہرے پر بکھیر دی ہیں ۔ تم کتنی دلکش ہو ۔ !"

اتنے میں تمام اسٹیج پر اندھیرا چھا گیا ـــــ تھوڑی دیر بعد خاموش فضا میں مدھم آواز میں ایک نغمہ اُبھرا ـــــ اس کے ساتھ ہی روشنی کا ایک نقطہ نمودار ہوا جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتے بڑھتے پھیل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مسعود اور روزی

کا وجود ایک دوسرے میں کھونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی روزی کو پڑے گرجا گھر کے سامنے صحن میں مسعود سے ملاقات یاد آگئی جب کہ مسعود نے کہا تھا۔

"روزی ـــــ! تم ایک انمول ہیرا ہو جیسے حسن و محبت کی چمک نے چراغِ شب بنا لیا ہے۔ تم نے واقعی میرے اُجڑے دیار کو اپنی محبت کی شمع سے روشن کر دیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں آج تک اکیلا جس ہستی کی تلاش میں بھٹکتا رہا ـــــ اب اس گوہر مراد کو میں نے پا لیا ہے۔ تم میری جان ہو ـــــ میری روح ہو۔"

اپنی نسبت تعریف سن کر روزی مسعود سے بغل گیر ہوئی اور اتنا کہہ گئی۔

"اس طرح چوری چھپے کب تک ملتے رہیں گے ـ؟"

"ارے ہم دونوں جلدی شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے"۔

مسعود نے برجستہ کہا تھا۔

"اس کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ کوئی ہماری طرف انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔"

"روزی بیٹیا ۔ ۔ ۔ ۔ روزی بیٹیا!"

بغل والے کمرے سے آواز آئی۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"ذرا پانی پلا دے ۔ ۔ ۔ ۔"

روزی پانی لے کر آئی۔ ماں نے بیٹی کو روتی ہوئی دیکھ کر اسے گلے لگایا اور وجہ پوچھی۔

روزی کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ دالان میں گھس کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

دفعتاً اس کے سامنے سعیدہ کا الفت سے لبریز چہرہ رقص کرنے لگا۔ اور پھر اس کے معصوم بچے کی صورت اس کے سامنے اُبھرنے لگی۔

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ میں ایسا نہیں کروں گی ـــــ اپنی خود غرضی کے لیے کسی اور کی زندگی جہنم نہیں بناؤں گی۔ خداوند یسوع مسیح نے سب دکھ سب غم خود ہی اُٹھائے تاکہ ہمیں دکھ سے آزادی مل سکے۔ میں پھر

کیوں نہ اس دکھ کو گلے سے لگا کر ایک بہن کی زندگی میں خوشیاں بھر دوں ..

. . . . . روزی کا استری پن واضح انداز میں اُبھرنے لگا۔ نوکری کو خیر باد کہے وہ اپنی بیمار ماں کے ساتھ شہر چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک نئی منزل کی طرف چل پڑی جہاں محبت کے پردے میں وفا پرستی کی بیخ کنی نہیں ہوتی۔ جہاں آدمی انسانیت کے معراج سے گر کے شرافت وانسیت کے پیرہن تار تار کر کے کسی ایک کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کرتا۔

دفعتاً اس کے چہرے پر اطمینان کے نقوش اُبھرنے لگے اور وہ ایک نئے جذبے کے ساتھ بلیدان کی راہ پر چل پڑی۔ وفا پرستی کی منزل کی جانب۔

کھڑکی میں نیلے رنگ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ اس سے چِھن چِھن کر ہلکی سی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔

امتیاز کا دبلا پتلا بدن ایک ہی پہلو سے لیٹے لیٹے درد کرنے لگا تھا۔ اس نے کروٹ لی ــــ اور نظر سامنے دیوار پر ٹنگی تصویر سے جاکر ٹک گئی ۔۔۔۔۔۔

وسیع و عریض میدان ۔ نہ کوئی پیڑ نہ کوئی پودا ۔ فقط ایک کچی مٹی کی دیوار جس پر ایک کوئی مغموم انداز میں بیٹھی ہے۔ اور کچھ فاصلے پر دو تھکے مسافر پگڈنڈی طے کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے بدگماں، جیسے ناراض اور لب خاموش ــــ!

امتیاز نے بستر پر لیٹے لیٹے دروازے سے باہر جھانکا۔ رضیہ آدھ ٹی بنیان گھٹنے پر رکھے نہ جانے کیا سوچنے میں مشغول تھی۔ دوپٹہ سر سے کھسک کر شانوں پر

آگرا ہے، شہادت کی انگلی دانتوں میں دبائے مسلسل خلاء میں گھور رہی ہے جیسے کچھ ہوش ہی نہیں ـــــــ!

امتیاز سوچنے لگا کہ اس وقت رضیہ کے دل میں کوئی نہ کوئی کشمکش ضرور موجود ہے۔ آخر کیا سوچ رہی ہوگی۔

دوسرے ہی لمحے امتیاز کے چہرے پر غیر معمولی درشنی رقص کرنے لگی۔ رضیہ کی طرف سے نگاہ ہٹائی تو الماری پر رکھے ٹائم پیس پر جا ٹکی۔ بارہ بجنے میں اب چند ہی منٹ کی دیر تھی۔ دوا کا وقت ہو گیا تھا۔

امتیاز پھر سوچنے لگا کہ آخر رضیہ کو کیا ہو گیا ہے۔ جو اس کی طرف سے بے پرواہ رہنے لگی ہے۔ دوا پینے کا وقت ہو گیا ہے اور اسے احساس تک نہیں کہ کون مرتا ہے، کون جیتا ہے۔

نہ جانے کب امتیاز کے دل میں یہ وہم گھر کر گیا تھا کہ رضیہ اب اسے نہیں چاہتی ـــــــ وہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے۔ نئی تہذیب کے آزاد ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اس کے برعکس خود اس کی زندگی بے نام اور چھوٹے سے قصبہ میں بڑی سادگی سے بسر ہوئی ہے۔ وہ سوٹ بوٹ نہیں پہنتا۔ شیو بھی روزانہ نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے رضیہ پر اعتراض نہیں کیا کہ وہ اشیاء حسن و کشش کیوں استعمال کرتی ہے؟ اس پر کوئی پابندی نہیں ـــــــ اور یہ جو اس کا چھوٹا بھائی اسلم ہے، جسے والدین کے مرنے کے بعد اُسی نے پالا پوسا ہے۔ اور آج کالج میں پڑھ رہا ہے اسے شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔ مغربی طرز سے رہنا اس نے اپنا معمول بنا لیا ہے ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۔ یہ رضیہ بھی اپنے دیور اسلم کے رنگ میں رنگ رہی ہے۔ حالانکہ اس کا شوہر موجود ہے۔ اُسے شوہر کے رنگ میں ڈوب کر اس کی رفیقہ حیات بن کر رہنا چاہیے۔

امتیاز سوچنے لگا کہ رضیہ اور اسلم کا اپنا پن اعتدال سے بڑھنے لگا ہے کبھی کبھی اس کے دل میں یہ بات کھٹکنے لگتی کہ رضیہ اتنی حسین کیوں ہے ـ ـ ـ؟

اور پھر بناوٹی آرائشوں سے اپنے حسن کو اور بھی نکھارنے کی کوشش کیوں کرتی ہے؟

امتیاز نے ایک سرد آہ بھری ـــــ ! گھڑی نے ٹن ٹن . . . . . بارہ بجائے اور اس کے خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا ۔

باہر دالان میں بیٹھی رضیہ جیسے ایک دم جاگ سی اٹھی ـــــ "دوا کا وقت ہوگیا ہے ۔"

وہ ادھ بنی بنیان اور اون کے گولے باسکٹ میں رکھ کر دوا پلانے کے لیے اٹھی . . . . . . اتنے میں بیٹھک سے آواز آئی ـــــ

"بھابی ! ذرا ادھر تو آؤ ـــــ"

امتیاز نے دیکھ لیا تھا کہ رضیہ دروازے تک آکر لوٹ گئی ہے ۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آگیا ۔ وہ کہہ کیوں نہیں دیتا کہ تم دونوں کا یہ برتاؤ اور دونوں کے طور طریقے ٹھیک نہیں ہیں . . . . . ۔ دیکھو تو ـــــ دوا پینے کا وقت بھی نکلا جارہا ہے . . . . ۔ اور اسے میری کچھ پرواہ ہی نہیں ۔ سوچنے کی بات ہے کہ اسلم سے ملنا اسے دوا پلانے سے زیادہ اہم تو نہ تھا ؟

بیٹھک سے دونوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں ۔ اسلم کہہ رہا تھا ـــــ "بھابی ، تم کھلاتی ہو تو کھانا بے حد لذیذ ہوتا ہے ۔"

امتیاز حسب معمول سوچنے لگا . . . . . اسلم رضیہ کی طرف پیاسی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا ۔ رضیہ ہنس رہی ہوگی ۔ پھر اسلم کو بھلا کھانا بہت لذیذ کیوں نہ لگے ۔ رضیہ اس کی بیوی ہے ۔ وہ اس پر حکم کیوں نہیں چلاتا ؟ . . . . آج وہ رضیہ سے صاف صاف کہہ دے گا کہ اس کی یہ روش درست نہیں ـــــ"

اس نے پکارا ـــــ

"رضیہ ـــــ"

بیٹھک سے رضیہ نے جواب دیا ۔

"آئی ـــــ"

امتیاز منتظر نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں اسلم بولا۔

"تھوڑی سی دال تو دے دو پھر جانا۔۔۔۔"

امتیاز سوچنے لگا کہ رضیہ اسلم کو دال دے کر پھر یہاں آئے گی۔

دال لینے کے بعد اسلم نے رضیہ سے ترکاری اور پھر چاولوں کی فرمائش کی۔ اس طرح رضیہ کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رضیہ اس کی طرف سے اس قدر لاپرواہ کیوں ہے۔

رضیہ کمرے میں داخل ہوئی ــــ ایک لمحہ کے لیے وہ امتیاز کے بدلے بدلے چہرے کو دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نگاہ گھڑی کی طرف اُٹھ گئی۔۔۔۔ ساڑھے بارہ بج گئے تھے۔ اسے یاد آیا کہ امتیاز کو دوا بارہ بجے دینی تھی۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ وہ اسی تذبذب میں میز کی طرف بڑھی اور دوا لا کر امتیاز کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔

امتیاز چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور رضیہ سہمی ہوئی سی کھڑی تھی. وہ جانتی تھی کہ اس سے واقعی بہت کوتاہی ہوئی ہے۔ وہ جرأت کر کے بولی۔

"دوا نہیں پیو گے کیا ــــ؟"

"نہیں رضیہ ــــ"، امتیاز نے اپنے لہجہ کو انتہائی ملائم کرتے ہوئے کہا۔

رضیہ کو امتیاز کا یہ انداز تکلم اچھا معلوم نہ ہوا۔ وہ چاہتی تھی کہ امتیاز اس کو ڈانٹے۔۔۔۔۔۔ اپنے خاوند ہونے کا حق استعمال کرے۔۔۔ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔

"تو دوا نہیں پیو گے ــــ؟"

جواب میں اس کی طرف سے منہ پھیرنے کی غرض سے امتیاز نے کروٹ بدلی ــــ رضیہ کچھ دیر کھڑی رہی ــــ اس کے دل میں آیا

کہ شیشی اور پیالی کو زمین پر دے مارے۔ لیکن اتنا ہی کہہ گئی۔

"اچھا ـــــــ نہ پیو ـــــ"

وہ دوا کی شیشی میز پر زور سے پٹخ کر باہر نکل گئی اور برآمدے کے ستون کے ساتھ دیر تک کھڑی رہی ـــــ اس کا جی چاہا کہ خوب کھل کر روئے۔ اسے محسوس ہوا کہ حالات میں بہت زیادہ تناؤ پیدا ہو گیا ہے ـ ـ ـ ـ امتیاز اس سے بچھڑ کر دور چلا گیا ہے۔ وہ بھرے دل کے ساتھ بنیان بُننے کے لیے بیٹھ گئی۔

وہ سوچنے لگی کہ اس گھر میں جب اس نے قدم رکھا تھا تو دل میں کتنے ارمان، کتنی اُمیدیں تھیں ـــــ شوہر اس کی پسند کا ملا تھا ـــــ وہ پھولے نہیں سماتی تھی۔ لیکن اچانک اس کے شوہر کے مزاج میں اتنا تغیر کیسے آ گیا۔

غرض امتیاز کا یہ ہمدردانہ سلوک ان کی ـ ـ ـ ـ یہ ناراضگی اور غصہ سے خالی محبت اب رضیہ کو قطعًا اچھا نہ لگا۔

وہ سوچنے لگی ـــــ آخر معاملہ کیا ہے؟ وہ سوچتے لگی ـــ آخر وہ مجھ سے کھل کر بات کیوں نہیں کرتے ـــــ؟

اس گھر میں اسے شوہر کے علاوہ ایک اور شخص کی محبت بھی حاصل تھی۔ وہ تھا اسلم، امتیاز کا چھوٹا بھائی ـــــ اسلم کی طبیعت اس کی طبیعت سے ملتی جلتی تھی۔ جب پہلے دن اسلم نے اس کا گھونگھٹ اُٹھا کے اچانک کہا تھا۔

"السلام علیکم بھابی جان ـــــ!"

اور وہ کھِل کھِلا کر ہنستا تھا۔

"یہ میرا بھائی اسلم ہے رضیہ! اسے سنبھالنا بھی تمہارا کام ہے۔"

امتیاز نے اندر آکر کہا تھا۔

پھر مسرت بخش ماحول میں دن گزرتے گئے۔ لیکن اب یہ غصہ کس لیے ـــــ؟ دوا نہیں پییں گے تو کس کا نقصان ہوگا؟

رضیہ نے سوچا کہ اسے جا کر معافی مانگ لینی چاہیے ـــــ امتیاز سے اور وہ اُٹھ کر امتیاز کے کمرے کی جانب روانہ ہوئی ـــــ اتنے میں بیٹھک میں سے اسلم نے پکارا ـــــ

"بھابی ـــــ"

"کیا ہے ـــــ؟" رضیہ نے وہیں سے پوچھا۔

"ادھر آنا تو ـــــ"

رضیہ ایک لمحہ رکی ـــــ اور پھر بیٹھک کی طرف چل پڑی۔

بیٹھک میں داخل ہوتے ہی وہ ششدر رہ گئی ـــــ اسلم بستر باندھ چکا تھا۔ شاید وہ کہیں جانے کی تیاری کر چکا تھا ـــــ رضیہ نے دیکھ لیا تھا کہ اسلم نے بیٹھک کی دیوار سے ایک تصویر اُتار کر اپنی اٹیچی میں رکھ لی ہے اس نے پوچھا ـــــ

"کہاں جا رہے ہو اسلم ـــــ؟"

اسلم کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے ایک نظر رضیہ کو دیکھا اور کہا ـــــ

"بہت دور جا رہا ہوں بھابی ـــــ! میری زندگی تجھ پر بوجھ سی بن کر رہ گئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ دونوں میں کسی طرح کی غلط فہمی پیدا ہو۔ اب اور ضبط نہ کر سکوں گا ـــــ میں نے تمہیں آخری بار دیکھنے کے لیے بلایا ہے"۔

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ رضیہ حیرت و تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسلم نے آنکھیں رومال سے صاف کر کے اٹیچی اُٹھائی۔

دفعتاً رضیہ نے اٹیچی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور تحکمانہ انداز میں بولی ـــــ "تم کہیں نہیں جاؤ گے ـــــ"

وہ اٹیچی کھول کر دیکھنے لگی ـــــ رومال، تولیہ، بنیان، کُرتا، اور یہ

تصویر ــــــــ!

اپنی چھوٹی بہن سلمیٰ کے ساتھ اپنی تصویر دیکھ کر رضیہ کے دل میں طرح طرح کے خیالات اُبھرنے لگے ــــ

اس نے ساکت و صامت اسلم کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

تم سلمیٰ سے محبت کا سوانگ بھرنے لگے ہو ــــ یہ نادانی کب سے سیکھی اور اپنی چاہت کا کبھی اظہار بھی نہیں کیا ــــ؟"

اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ـ ـ ـ ـ "اب تم نہیں جا سکتے۔"

یہ کہہ کر رضیہ نے بستر و اٹیچی ایک کمرے میں بند کر دیے ــــ چابی ساتھ لے کر امتیاز کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

امتیاز کا دل رو رہا تھا ــ لیکن وہ اپنے آنسوؤں کو اپنی پلکوں کے پردے میں چھپائے ہوئے تھا ــــ اس کا دل بار بار اس سے یہی سوال کرتا تھا۔ آخر رضیہ نے اسے دوبارہ دوا پینے کے لیے کیوں نہ کہا۔؟

وہ سامنے آویزاں تصویر کو دیکھتے ہوتے یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ رضیہ نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"دیکھو جی ــــ ایک بات تو تمہیں معلوم ہی نہیں ــــ یہ جو اسلم ہے نا ــــ تمہارا بھائی۔ میرے ساتھ ساتھ میری چھوٹی بہن سلمیٰ سے محبت کرنے لگا ہے۔ اور ابھی ابھی گھر چھوڑ کر جا رہا تھا کہ اس کے من کی مراد کیوں نہیں پوری ہوتی؟ اب بہت جلد اس کی شادی کرنی پڑے گی۔ سلمیٰ کی بابت تمہارا کیا خیال ہے ـ ـ ـ؟ وہ یہ بات کرتے ہوئے بڑی سادگی سے ہنس دی۔

امتیاز نے تجسس سے لبریز نگاہوں سے رضیہ کی طرف دیکھا ــ وہ ابھی تک کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

اسے وہ انتہائی حسین اور دلفریب دکھائی دی۔ فرطِ محبت میں اس نے رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر دبا دیا اور دونوں غیر ارادی طور پر مسکرا دیے۔

امتیاز نے دیوار والی تصویر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھو رضیہ ـــــ وہ دونوں مسافر کس قدر محبت سے ایک ساتھ چلے جا رہے ہیں ـــــ میں نے اپنی بد گمانی کی وجہ سے یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور دور ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حالاں کہ وہ دونوں ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر زندگی کی راہوں پر گامزن ہیں ۔ ایک ہی منزل کی جانب ۔"

دونوں پلنگ پر بیٹھے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے اور اسلم ان کے پیروں پر ڈھیر ہو گیا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے میاں بیوی کے درمیاں بد گمانی کی دیوار ریت کے تودے کی مانند پاش پاش ہو کر رہ گئی ۔
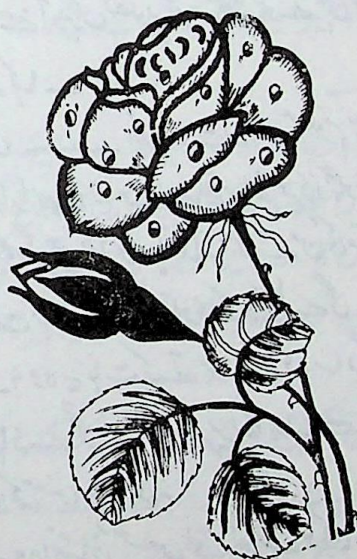
خوشیوں کی آہٹ

میرا خیال ہے کہ جبل پور میں اگر رکشہ والے نہ ہوں تو شہر کی رونق پھیکی پھیکی سی پڑ جائے گی، جس جانب اور جہاں کہیں بھی دیکھیے ـــــ رکشہ والوں کی لائن لگی رہتی ہے۔ خود ننگے پاؤں رہ کر اور پھٹے پرانے کپڑے پہن کر گرمی و سردی کا مقابلہ کر کے وہ زندگی کو ناز زندگی بناتے میں مجبور رہتے ہیں۔ لیکن اپنے رکشاؤں کو دلہن کی طرح سجانے، سنوارنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے ـــــ جب بھی میں نے کہیں آنے جانے کی خاطر رکشہ ٹھہرایا تو منہ مانگا کرایہ ادا کیا ـــــ دراصل مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ ایک غریب آدمی آزاد گھوڑے کی طرح رکشے کو ہانکتا پھرے اور اس کی محنت کا اسے پورا پورا معاوضہ نہ ملے۔ سسرال میں ہر ایک مجھ سے نالاں کہ میں نے رکشہ والوں کو منہ مانگی رقم دے کر ان کی عادتیں بگاڑ دیں۔

ان رکشہ والوں میں مجھے ڈیوڈ سے اُلفت سی ہو گئی ہے۔ ایک لگاؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ کم از کم کپڑے صاف پہنا کرتا ہے۔ عابدہ بہن کو کالج پہنچاتا اور واپس لے آتا ہے۔ اس کے بدلے میں رقم اسے ماہ بہ ماہ ملا کرتی ہے۔ مجھے سیر کو لے جانے کے لیے وہ صبح پانچ بجے حاضر ہو جاتا ہے۔ جون کی جھلستی گرمی میں صبح یا شام کے اوقات میں ہی بازار یا اور کسی جگہ کا چکر لگایا جا سکتا ہے۔ دن میں نکل کے اور وہ بھی وادی کشمیر کے رہنے والے کے لیے موت کے فرشتے کو دعوت دینے کے مترادف ٹھہرا۔

ڈیوڈ بڑا ہنس مکھ ہے اور راستے بھر میں ہر نیک نام و بدنام ہستی و جگہ کی نسبت تفصیل کے ساتھ حال بیان کرنا اس کا معمول ٹھہرا۔ جہاں کہیں عالی شان محل دیکھا کوئی کھنڈر نما عمارت نظر آئی تو ان کی بابت وضاحت کے ساتھ قصے اور کہانیاں گوش گزار کرتا ہے۔ البتہ ایک ہی عادت اس کی جو مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ یہ کہ سرِ شام شراب پی لیتا تھا۔

حسبِ معمول ڈیوڈ صبح سویرے حاضر ہوا میں بیڈ ٹی لے رہا تھا۔ آغا صاحب کے مزار جانا تھا۔ بھائی نام کی شرکت میں۔ اس سے قبل کہ ہم میں سے کوئی اس کے ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتا اس کے لب و لہجہ و حرکات سے ہمیں یہ جاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس نے اب کی بار صبح ہی صبح چڑھا رکھی ہے۔

"ڈیوڈ کیوں اپنی زندگی سے کھیل رہے ہو۔ میں کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ اس طرح اپنی زندگی کو تباہ کرنے سے تمہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ آج تو تڑکے ہی . . . تم چڑھا کر آئے ہو۔" مجھ سے نہ رہا گیا اور گھنٹہ گھر چھوڑ عدالت چوک کی جانب چلتے میری زبان غیر ارادی طور پر کھل گئی۔ میری بات سن کر کچھ دیر ڈیوڈ چپ رہا اور پھر بولا۔

"بابوجی ـــــ میری زندگی میں رہا ہی کیا ہے، جو میں زندگی بنانے یا سنوارنے کی بابت سوچوں ـــ؟"

"یہی تو تمہاری غلطی ہے ڈیوڈ! اس قدر ناامید ہونا اچھا نہیں ـــــ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا وارث خود اللہ ہوتا ہے وہ ہر ایک کا پالنہار ہے

اور آڑے وقت میں ساتھ دینے والا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔تم اس حقیقت کو کیوں بھولتے ہو؟"

میں نے ڈھارس باندھی۔ کچھ توقف کے بعد رکشہ کی رفتار مدھم کیے اور بغیر ہماری طرف منہ پھیرے ڈیوڈ گلوگیر آواز میں کہہ گیا۔

خدا کا نام مت لو بابوجی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔! کس کا خدا۔ ۔ ۔ ۔ ۔کسی ایک نے اسے دیکھا ہے؟ ــــــ ایک بزرگ تھا جس کو خدا کا بیٹے کہنے کی پاداش میں لوگوں نے سولی پر لٹکا دیا ــــ ہاں ہاں! سولی پر چڑھا دیا۔ اُس خدا نے مجھے کیا کچھ دیا ہے؟ ــــــ البتہ اتنے وسیع وعریض جہاں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا ہے ــــ"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے ــــــ"

اے ناصر میاں بات کاٹتے ہوئے بولے ــــــــ

"خدا ہر ایک کا خیال رکھتا ہے۔ وہ خالق ہے اور اپنے مخلوق کے دُکھ سکھ میں برابر شریک رہتا ہے۔ کامیابیاں و ناکامیاں ہر ایک کے حصے میں آئی ہیں۔ خوشی و غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جہاں دھوپ ہے وہاں چھاؤں آئے گی، جس باغ کو آج موسم خزاں کے تھپیڑوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اس پر موسم بہار کی رونق بھی چھائے گی۔ یہ اس جہاں کا دستور ہے۔ ہر کالی رات کے بعد اُمیدوں سے لبریز صبح طلوع ہو کے رہتی ہے ــ"

یہ سب سن کر ڈیوڈ برجستہ کہنے لگا۔

"لیکن ــــــ بابوجی ــــــ میں نے جنم لینے سے اب تک صرف دُکھ اور آلام ہی کو اپنی زیست سے ملحق پایا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی ہستی کو غموں کے اندھیروں میں مقید پایا ــــ ثانیہ بھر کے لیے خوشی نام کی چیز مجھ سے وابستہ نہ رہی ــــ"

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ڈیوڈ کی آواز بھر آگئی اور لڑکھڑانے لگی ــ

"ڈلیوڈ! ناامید نہیں ہونا چاہیے! دیکھو شکست کی آواز نکالنا مردوں کا کام نہیں۔ تم نے پی رکھی ہے۔ اس لیے بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو" میں نے موضوعِ سخن بدلنے کی نیت سے کہا۔ پر اس کی زبان بند نہ ہوئی۔

"میں بہکا نہیں ہوں بابوجی ——! پینا میری زندگی ہے، لے دے کے یہی ایک سہارا ہے جو ہر حالت میں میرا ساتھی بنا رہتا ہے۔ کچھ گھونٹ حلق پر انڈیلنے میں اس زمانہ کی چیرہ دستیوں کو کچھ وقت کے لیے فراموش کر جاتا ہوں۔

——۔ بابوجی! میں اس قدر بدقسمت ہوں کہ مجھے معلوم نہیں کس کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ میں اپنے باپ کو نہیں جانتا ہوش سنبھالا تو اپنے کو عیسائی یتیم خانہ میں پایا۔ یہ میری کہانی ہے۔ کیا میرا باپ نہیں ——؟ کیا کسی عورت نے ۹ ماہ مجھے اپنی کوکھ میں نہیں رکھا ——؟ پھر مجھے اس نے اپنے سے الگ کیوں رکھا؟ —— لاتعداد مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے اس جہاں میں کس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔؟ آپ ہی بتائیے نا میرا کیا قصور ہے یا تھا جو اس کڑے انداز کی سزا مجھے ملی ہے بتائیے نا۔ ۔ ۔ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟"

"پگلے! خدا سب کچھ جانتا ہے۔ وہ غیب کا علم رکھتا ہے —— نہ جانے کون سی خوشی تمہارا انتظار زندگی کے کس موڑ پر کر رہی ہوگی —— ناامید نہ ہو حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کو یاد کرو کہ کس انداز سے انہوں نے جہاں بھر کے غموں کو اپنایا اور خوشی خوشی ہر تکلیف کو برداشت کیا۔ صرف اس لیے کہ اس کی امت کے لوگ دکھی نہ ہوں۔ نہ جانے کل کا سورج کون سی خوشی لے کر ابھرے گا۔"

میری بات سن کر ڈلیوڈ نے چپ سادھ لی اور آغا صاحب کے مزار کے قریب مجھے اور نام کو اتارے وہ بیڑی سلگائے کش پر کش لینے لگا۔

نام میاں کی زبانی اتنی جانکاری بھی ہوئی کہ ڈلیوڈ کا اپنا رکشہ نہیں ہے۔ بلکہ ہزاروں رکشہ والوں کی طرح وہ رکشہ کرایہ پر لے کر چلایا کرتا ہے۔ رکشہ کا مالک بابو رام ہے ۔ ۔ ۔ بابو رام سے مجھے ایک بار ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔

اچھی صحت کے مالک، جون کے مہینے میں پنکھا چلانے کی ضرورت نہیں سمجھتے تاکہ پسینے واضح انداز میں خارج ہوں۔ اور صحت برقرار ہے۔ اس کے پاس کم از کم ۵۰ رکشے ہیں جنہیں وہ کرایہ پر دیا کرتے ہیں اور روزانہ اپنا کرایہ وصول کر لیا کرتے ہیں۔ حساب و کتاب رکھنے کے لیے رام بابو نے ہر رکشہ والے کے لیے الگ الگ کتابچہ کھول رکھا ہے جس میں لین دین سے متعلق ہر رقم درج رہتی ہے دن بھر پلاٹ والی دکان پر بیٹھے کسی نہ کسی رکشہ کی نوک پلک سنوارنے میں مشغول رہتا ہے۔

بابو رام خود ایک تجربہ کار مستری ہے وہ ڈیوڈ سے بہت خوش ہے کیوں کہ وہ اپنے کپڑوں کی طرح رکشہ کو بھی سنوار سجا کر رکھتا ہے اور مشکل سے ہی کوئی پرزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ کافی احتیاط کے ساتھ رکشہ چلایا کرتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے رکشہ والے روزانہ کوئی نہ کوئی پرزہ خراب کر کے آتے ہیں۔

مجھے نربدا روڈ اپنے یار غار مسٹر بجاج سے ملنے جانا تھا۔ چار کلو میٹر کا سفر اور نصف سے زیادہ چڑھائی اس پر ڈیوڈ کی ضد کہ میں اس کے رکشے پر چلوں! میں نے لاکھ سمجھایا کہ بس یا ٹمپو میں چلا جاؤں گا۔ لیکن اس بندۂ خدا نے ایک نہ مانی۔ چار و ناچار میں رکشے میں سوار ہوا۔

منزلیں طے کرتے ہوئے باتوں ہی باتوں میں ڈیوڈ کی دکھتی رگ کو چھیڑتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"ڈیوڈ — ! اب اپنی زندگی بنانے کی بابت سوچنا تھا۔ اکیلے کب تک رہو گے کسی ایک سے منسلک ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے —؟"

بدلے میں ڈیوڈ نے سرد آہ کھینچی — اور چپ چاپ رکشہ آگے ہیڈیل کی طرف گھسیٹنے لگا — میرے اصرار کرتے پر ڈیوڈ نے قفل سکوت توڑ دیا۔

"بابو جی — خدا کے لیے ایسی بات میرے ساتھ نہ کیجیے میں نے کہا نا کہ میں بدنصیب ہوں — زندگی بنانے اور سنوارنے کی بابت سوچنا بھی میرے لیے پاپ ہے"

عابدہ بہن کی وساطت میں جان گیا تھا کہ ڈیوڈ نے بینا نامی بھکارن کو دل و جان سے چاہا تھا۔ بینا بلا کی خوب صورت بھی تھی۔ متوازن خد و خال ــــــ بس ایک کمی تھی کہ وہ اندھی تھی۔

ڈیوڈ چاہتا تھا کہ وہ بینا کو اپنی زندگی سے وابستہ کر لے۔ اپنے ایک دوست کو بینا کی ماں درگاوتی کے پاس بھیجا تھا تاکہ شادی کی بات پکی ہو، تو درگاوتی شیرنی کی طرح بپھر گئی کہ " وہ اتنی گری ہوئی نہیں ہے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی ایک کرسچین بچے سے کرے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا، کیا ہوا ہم بھکاری ہیں لیکن برہمن تو ہیں ــــــ آخر مذہب اور ذات پات بھی کچھ ہے۔"

"تم کہو تو میں ــــــ درگاوتی کے پاس جا کر بات کروں۔"

"نہیں بابوجی ــــــ ایسا نہیں کرنا میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔" ڈیوڈ بات کاٹتے ہوئے کہہ گیا۔

"میں اس کے پاس خود چلا گیا تھا۔ اس کے پاس گڑ گڑایا تھا۔ میں نے اور بینا نے اکٹھے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے لیکن بے رحم بڑھیا نے یہ کہا کہ " مجھ سے وابستہ کرنے سے بہتر ہے کہ وہ بینا کا گلا گھونٹ دے"

گویا میرے لب سی دیے میں آگے کچھ نہ کہہ سکا ــــــ بابوجی ــــــ! نہ جانے کیوں اس نے بینا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے سے انکار کیا ــــــ یہ دنیا محبت کرنے والے کو کیوں ملنے نہیں دیتی ــــــ؟ میں نے ایک بار پھر اکیلے میں درگاوتی کے پاؤں پکڑ لیے ــــــ بچوں کی طرح رویا ــــــ منت سماجت کی لیکن اس نے ایک نہ سنی اور اپنے پالتو کتے ہردیال کو بلا کر میری پٹائی کروائی۔"

محبت ایک پاک جذبہ ہے ذات پات سے الگ ــــــ بابوجی! نہ جانے یہ مذہب کی دیواریں محبت کے سامنے کیوں حائل ہوتی ہیں ــــــ؟"

میں نے ڈیوڈ کی دگر گوں حالت بھانپتے ہوئے اس بابت مزید کچھ پوچھنا مناسب نہیں جانا اور چپ سادھے رسالہ "چترا" ویکلی دہلی کی ورق

گردانی کرنے لگا۔

ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ سننے میں آیا کہ بینا کو کچھ غنڈے مال غنیمت جان کر لے اُڑے۔

دراصل شیو مندر کے پاس وہ کشکول پھیلائے بیٹھی تھی کہ کسی کے آہنی ہاتھوں نے اس معصوم کو دبوچ لیا ـــــ اور آن کی آن میں گاڑی میں ڈالے یہ جا اور وہ جا ـــــ

درگاوتی کو معلوم ہوا تو اس پر غشی طاری ہوئی۔ مانو کسی ایک نے اسے کھولتے پانی میں ڈال دیا ہو ـــــ اس نے بلا سوچے سمجھے ڈیوڈ کو پکڑوایا۔

لیکن ڈیوڈ برابر تین دنوں سے بخار میں لت پت اپنے جھونپڑے میں پڑا تھا جس کی گواہی آس پاس میں رہنے والوں نے دی تھی۔

ایک مخبر نے پولیس کو اطلاع دی کہ ڈال چند اور اس کے ساتھی ایک لڑکی کو بیڑا گھاٹ کی جانب لے جا رہے تھے۔ ڈال چند کا نام سنتے ہی تھانیدار مسٹر شرما کے چہرے کا رنگ اُڑنے لگا۔ ہر ایک ڈال چند سے ڈرتا تھا اور اس سے لڑائی مول لینا تو خود اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے کے مترادف ٹھہرا۔ کچھ دن گزر گئے۔

پولیس ڈال چند اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو بھی نہ پکڑ سکی۔ البتہ بینا کو بے ہوشی کی حالت میں نربدا ندی کی جھاڑیوں کے جھرمٹ میں سے اُٹھا لائی۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

ڈیوڈ کے ساتھ اب بینا کی بابت بات چیت کرنا اُسے دُکھ دینے کے برابر تھا۔ میں نے بھی اس نسبت خاموشی اختیار کی۔

کل رات کی گاڑی سے واپسی کا سفر شروع کرنے کی غرض سے میں نے ریلوے اسٹیشن سے سیٹ بُک کرالی۔ ڈیوڈ کو میں نے وقت پر آنے کی تاکید کی ـــــ! ریل ساڑھے ۹ بجے چھوٹنے والی تھی۔

ساڑھے آٹھ بجے تک ڈیوڈ نہیں آیا۔ مجبوراً دوسرا رکشہ ٹھہرا کر میں

ناصر میاں کی شرکت میں ریلوے اسٹیشن چل پڑا۔ گاڑی چھوٹنے میں چند منٹ باقی تھے کہ ہم نے ڈیوڈ کو اپنی جانب آتے دیکھا ــــ اس کے ساتھ سُرخ جوڑے میں ملبوس ایک لڑکی تھی۔ جس کا ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ساتھ میں ایک معمر خاتون تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اور ناصر کچھ پوچھ لیتے، ڈیوڈ نے آداب بجالانے کے بعد کہا ــ

" بابوجی ــــ! معاف کرنا میں رکشہ لے کر وقت پر نہ آسکا۔ مجبور تھا۔ بینا کو ہسپتال سے نکال کر میں نے درگا مائی کی اجازت سے اس کے ساتھ شادی رچائی ہے۔ یقین کیجیے بابوجی ــ! یہ سب کچھ اچانک ہوگیا ہے۔ اور میں کسی ایک کو بھی اس مبارک تقریب پر نہ بلاسکا۔ ۔ ۔ بابوجی ــ! ہم ایک دوسرے کے سدا کیلئے ہوگئے ہیں اور اب ہمیں کوئی جدا نہیں کرسکتا ــــ"

میرا رُوم رُوم ایک انجانی خوشی سے تمتما اٹھا اور میں بھرپور انداز میں بینا اور ڈیوڈ کو گھورنے لگا ــــ میں نے ایک گہری نظر دُرگا وتی پر ڈالی جو کچھ فاصلے پر کھڑی سوچ رہی تھی۔ غیر ارادی طور ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ اور کچھ نوٹ نکال کر میں نے بینا کے ہاتھ میں تھما دیے۔ " خدا تمہاری جوڑی سلامت رکھے۔ ڈیوڈ! میں اُمید کرتا ہوں کہ تم اب خوش رہو گے۔ زندگی بنانے کے اقدام اُٹھاؤ گے اور پینے کی عادت ترک کردو گے۔ اب تمہاری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں ۔" اتنے میں گاڑی نے آخری وسل دی، اور ناصر سے اجازت لے کر میں ڈبے میں سوار ہوگیا۔ نظروں سے اوجھل ہونے تک سب الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے رہے۔ پھر سلیپر سیٹ پر لیٹے میں سوچنے لگا کہ محبت بھی کتنا پاک جذبہ ہے۔

ایک وشال دریا کی طرح ــــ دریا بھی نہ جانے کس کس طرح کی گندگی کو اپنی کوکھ میں چھپائے بلاکسی احتجاج کے بہے جارہا ہے۔ اسی طرح محبت بھی گندگی، قباحت اور وحشیانہ پن کو اپنی وشال گود میں لیے محبوبہ اور محبوب کے دلوں کو داغدار ہونے نہیں دیتی! اسی لیے داناؤں نے کہا ہے کہ محبت اندھی ہوا کرتی ہے جو کہ برائی اور بھلائی نہیں دیکھتی ــ ★★★

رنج و راحت

کیا خوب کہا ہے کسی نے " دہلی ہے دل ہندوستان کا۔"
نہ جانے کس زمانے کی یہ کہاوت ہے اب تو صرف نئی دہلی کی نسبت اس طرح کی بات کہی جا سکتی ہے۔ پرانی دہلی کا محل وقوع بخدا ہنگاموں، آفتوں، افراتفریوں اور شورشوں سے لبریز نظر آتا ہے۔
اس پرانے شہر کی حالت برابر ایک اونٹ کی سی ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ اس پُر ہنگم شہر میں مجبوری کی حالت میں کچھ ایام گزارنے کا موقع احقر کو بھی مل گیا ــــ اس سے قبل ہر وقت میں کشمیر ہاؤس چانکیہ پوری یا پرتھوی راج روڈ میں قیام کرتا تھا۔ اور اگر یہاں جگہ نہ ملتی تو نئی دہلی اسٹیشن کے قریب ہی کسی ہوٹل میں بسیرا کر لیتا مگر دہلی کے اندرونی علاقہ چوڑی والان میں ایک لاج میں ٹھہرنے کا موقع پہلی

بار ملا ـــــ دراصل ابا حضور ساتھ میں تھے ۔ اُن کا اصرار تھا کہ پرانی دہلی جامع مسجد کے قریب ہی قیام کریں گے ۔ تاکہ ان کی عبادت میں کسی طرح کا خلل نہ پڑے ۔

کچھ روز اس لاج میں گزار کے مجھے عذاب عظیم سے واسطہ پڑا ۔ طرح طرح کی پریشانیاں اُٹھانی پڑیں ۔ اور قسم کھا بیٹھے کہ اب کبھی اس راج دھانی میں آنے کا اتفاق ہوا تو پرانی دہلی کا رُخ نہ کریں گے ۔

اُف جامع مسجد کے آس پاس بھی ماحول کس قدر پراگندہ اور کثیف رہتا ہے . مینا بازار کے قیام کے بعد بھی مختلف چیزیں فروخت کرنے والے تنگ سڑکوں و گلیوں کا ایک خاصہ حصہ قبضنے میں کر لیتے ہیں ۔ جس کی وجہ سے پیدل چلنے والوں کو بھی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

جامع مسجد سے دریا گنج، اجمیری گیٹ، لال کنواں، چاندنی چوک جاتے کے لیے گلی نما سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے ۔ رکشوں، تانگوں، اسکوٹروں اور راہ چلتے لوگوں کا تانتا دن بھر کیا بلکہ رات بھر دیر گئے تک لگا رہتا ہے ۔ کسی بھی سڑک، یا گلی کو پار کرنے کے لیے کلیجہ چاہیے ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ رکشے والے تنگ گلیوں میں جگہ بنائے کیسے آگے بڑھتے ہیں ـــــ ! اور رکشے پر سفر طے کرنا پرانی دہلی کے مکینوں کی عادت سی بن گئی ہے ۔ ورنہ یہ بھی سچ ہے کہ رکشہ کے بجائے آپ پیدل جلدی سفر طے کر سکتے ہیں ۔

ایک بار سوئی والان سے چوڑیوالان آنا تھا ۔ ابا حضور کو عمر رسیدہ ہونے کے سبب رکشہ کر دیا اور میں خود پیدل چلتا بنا ۔ یقین کیجیے کہ میرے پہنچنے کے آدھا گھنٹہ بعد ابا حضور لاج میں قدم رنجہ ہوئے ۔

غرض دہاں کے لوگوں کو سواری کی عادت پڑ گئی ہے ۔ نئی سڑک کے نکڑ سے اور چتلی قبر کے چوک سے جامع مسجد تک لوگ رکشہ کر لیتے ہیں ۔ اور تو اور مینا بازار سے لے کر لاجپت رائے مارکیٹ تک گھنٹہ بھر رکشے میں بیٹھے سفر طے کریں گے مگر پیدل نہ چلیں گے ۔

سٹی بس سروس کا انتظام بہتر ہے لیکن جامع مسجد کے علاقے میں بسوں کا چلنا پل صراط سے گزرنے کے مترادف ٹھہرا۔

اپنے لاج کا گرد و نواح بھی عجیب سا ہے، اندرونی گنجان آباد بستی میں ایک نام نہاد ہوا محل تعمیر کر دیا گیا ہے۔ کمرے ہیں یا کال کوٹھریاں۔ اکثر کمرے تین جانب سے بند پڑے ہیں۔ اور ایک جانب دروازہ کے ساتھ روشن دان نما کھڑکی کھلتی ہے۔ کمرے سے ملحق باتھ روم نے بھی تین فٹ یا چار فٹ جگہ گھیر لی ہے۔ جس میں نہانا کیا منہ ہاتھ دھونے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ ان تمام دقتوں کے باوجود یومیہ کرایہ ۱۰۰/۱۲۰ روپے ادا کرنا ہے۔ مسافروں کے آرام کا کوئی لحاظ نہیں، البتہ رقم بٹورنے میں سب آگے آگئے ہیں۔ اپنے اپنے مکانوں کے کچھ حصے کو گیسٹ ہاوس و لاج کا نام دے کر دہلی والے رقم کثیر کرایہ کے طور وصول کر رہے ہیں۔ لوگوں کی مجبوری کا خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ہاں تو کل رات میری طبیعت اور زیادہ گھبرا گئی۔ ہوا یوں کہ عین لاج کے عقب میں جس طرف ہمارے کمرہ نمبر ۲۰۸ کا دروازہ کھلتا ہے۔ بستی میں رات بھر ناچ گانا ہوا ـــــ بے ڈھنگے گانے اور بے ربط ناچ ـــــ اس شور سے رات بھر نیند نہیں آئی اور ساری رات بے چینی میں کٹ گئی۔ صبح معلوم کرنے پر علم ہوا کہ دھیرو مستری کے ہاں چار لڑکیوں کے بعد ایک لڑکے کا جنم ہوا ہے جس کی خوشی میں رات بھر ہنگامہ رہا۔ وسط دسمبر کی سرد رات اور پھر رات بھر گانا بجانا۔

میں سوچنے لگا ـــــ کہ آج کل تو ایک بچہ پالنا بھی دشوار ہے اور پھر لڑکے کی تمنا میں دھیرو مستری نے خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں پر عمل نہ کرتے ہوئے اپنے اور بچوں کے مستقبل کو بے لذت و بے سواد بنا کے رکھ دیا ہے ـــــ ـــــ یہ حقیقت اسے آگے تڑپائے گی جب کہ دھیرو بڑھاپے کی سرحد پار کیے ہمت کھو دے گا۔ اور بچیاں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھیں گی۔ خدا کرے اس کی بچیوں کا مستقبل شاندار ہو ـــــ بھلا میں سوائے دعا کے دھیرو کو

کیا دے سکتا تھا۔

دہلی کو خیر باد کہنے سے پہلے حسب عادت میں برادرم توفیق فاروقی ایڈیٹر خاتون مشرق سے ملنے کے لیے مٹیا محل چلا گیا، ان کی با برکت صحبت میں کچھ وقت گزار کے مہتہ صاحب و عزیزم فرید کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کیے لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا جامع مسجد کی جانب چل رہا تھا۔

ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ مخالف سمت سے کسی برقعہ پوش خاتون نے سلام سے نوازا ـــــ میں لمحہ بھر رکا اور پھر یہ سوچ کر کہ میرا کون واقف ہوگا آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ محترمہ متذکرہ نے سکوت حیرت توڑتے کی کوشش کی

"میں آپ سے ہی مخاطب ہوں۔"

"مجھ سے ـــ؟ ـ مگر ـــــ"

"فکر نہ کریں ـــــ میں آپ کو جانتی ہوں ـــ" محترمہ بات کاٹتے ہوئے گویا ہوئی۔

"آپ کی شادی جبل پور میں ہوئی ہے نا ـــــ؟"

جبل پور کا نام سن کے مجھے یقین ہوگیا۔ کہ یہ خاتون مجھ کو جانتی ہے۔ اور جان پہچان والوں میں سے ہے۔ اتنے میں اس نے برقعہ کا اگلا پٹ اُلٹ دیا۔ ـــــ اور میں نے نظریں ملاتے پہچاننے کی کوشش کی ـــــ لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی ـــ

"کیوں پہچان لیا ـــــ کہ نہیں؟"

"معاف کیجیے! میں نے آپ کو واقعی نہیں پہچانا ـــــ؟"

"ارے دولہے میاں ـــ آپ ڈی او صاحب کے داماد ہیں اور لاڈلی بیگم آپ کی شریک حیات کا نام ہے ـــ" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

اور مزید جاننے کی ٹوہ میں میری زبان کام کر گئی۔

"یہ سب درست ہے مگر آپ اپنا تعارف تو دیجیے ـــ"

"اوہ ـــــ ! میں رضوانہ ہوں، آپ سے جبل پور میں کچھ سال قبل ملاقات ہوئی تھی ـــــ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میری زندگی پر ایک طویل کہانی تحریر کریں گے ـــــ اس کہانی کا کیا بنا ؟"

"بس بس ! رضوانہ میں نے پہچان لیا ـــــ"

اس کے ساتھ ہی کوئی دس برس قبل کے واقعات ایک ایک کر کے میرے سامنے رقص کرنے لگے ـــــ دراصل میں نہ سگریٹ پیتا ہوں اور نہ ہی غم غلط کرنے کی کوئی اور راہ اختیار کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ جب تک کہانی کا پلاٹ میرے سامنے نہ منڈلائے میں کاغذ داغدار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کہانی کی تلاش میں ایک شام جبل پور کے بدنام علاقہ لکڑ گنج کو اپنے یار غار تیواڑی بھائی کے ساتھ چلا گیا۔ وہاں رضوانہ کا گانا سن کے اور اس کی معصومیت بھانپ کے میرے احساسات کو ٹھیس لگ گئی اور میں نے کسی نہ کسی طرح رضوانہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کر دی۔

تیواڑی کی کوشش کے باعث ایک دن رضوانہ نے مدن محل کی پہاڑی والے چبوترے پر بیٹھ کر اپنی کہانی سنائی تھی کہ کیسے وہ اس بازار حسن کے پُرکشش ماحول کو اپنا گئی ہے۔

والدین کی موت کے بعد خالہ نے اسے پالا اور پڑھایا لکھایا۔ مگر خالہ کی لالچی طبیعت نے رضوانہ کی جوانی کا سودا کرنا چاہا۔ اور پھر ایک رات وہی کچھ ہوا جس کے تصور سے ہی رضوانہ کانپ اُٹھتی تھی۔ اسے کوٹھے کی زینت بنانے کے لیے گلاب جان نے اچھی خاصی رقم صرف کر دی۔ قبول صورت ہونے کے ساتھ ساتھ رضوانہ نے گلا بھی اچھا پایا تھا۔ گلاب جان نے پیسہ و نام کمایا ! رضوانہ پڑھی لکھی تھی اور اس پراگندہ ماحول سے ہمیشہ کے لیے نکلنا چاہتی تھی۔ مگر میں مجبور تھا۔ جاتے وقت رضوانہ نے مجھ سے التجا کی کہ اس کی زندگی کی بابت کچھ تحریر کروں ـــــ !

اب رضوانہ کے خدوخال کافی بدل گئے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں اب وہ چمک نہیں رہی ہے اور چال ڈھال میں بھی گراوٹ آئی ہے۔

خیر ——! باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ رضوانہ دہلی میں اسکول ٹیچر ہے اور اس کے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا اور زندگی اچھے ڈھنگ سے گزر رہی ہے۔

دراصل سات سال قبل بدنام اڈوں کی نشاندہی کے سلسلے میں خفیہ پولیس دستے نے لکڑ گنج کے کوٹھوں کی تلاشی لی تھی۔ کچھ لڑکیاں برآمد کی گئیں جن میں رضوانہ بھی تھی۔

اس خفیہ پولیس دستے میں دہلی کے ایک شریف النفس نوجوان کامران بھی شامل تھے جنہوں نے رضوانہ کی روئیداد سن کر اس کی جانب دست اعانت دراز کر دیا اور پھر اس کے ساتھ باضابطہ شادی کر لی۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ابھی بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو بے بس عورتوں پر کفا جفا نہیں دیکھ سکتے۔ جن کے دل انسانیت اور اُنسیت سے لبریز ہیں اور جو عورت کی عفت و پاک دامنی کا تحفظ کرنے کی غیرت رکھتے ہیں —— آفرین ہے ایسے روشن ضمیر اشخاص پر۔ اگر ہر نوجوان میں اسی انداز کی غیرت و مروت و رواداری کا جذبہ جاگ جائے تو یقیناً کسی بے کس و مجبور لڑکی کی عزت کا سودا نہ ہوگا۔ اُس کی جوانی کسی بازارِ حسن کی زینت نہ بنے گی۔ یقین کیجیے کہ رضوانہ، اُس کے بچوں اور خاص کر کامران سے مل کر مجھے بے حد خوشی حاصل ہو گئی۔ میں اُس تکلیف و گھٹن کو فراموش کر گیا جو مجھے دہلی کے اس پُرہنگم علاقے میں کچھ روز قیام کرنے میں حاصل ہو گئی تھی —— سچ تو یہ ہے کہ اس پرانی دہلی کی گود میں پلے ہزارہا تکلیفوں کے مقابلے میں ایک نا ختم ہونے والی خوشی و بشاشت سے واسطہ پڑا اور رضوانہ کی آباد زندگی کو دیکھ کر ایک اُمید کا چراغ ذہن کے تاریک گوشے میں روشن ہوا جو یقیناً اپنی لازوال ضیا پاشی سے سارے وجود کو منور کرنے میں کامیاب اُترے گا۔ البتہ رنج و راحت سے لبریز دہلی کا یہ سفر مجھے زندگی بھر یاد رہے گا۔ ★★★

مانگے کا اُجالا

کرشن یوں تو بظاہر خوش نظر آتا تھا۔ لیکن اس کے سینے میں ایک غم ضرور تھا۔ جو اندر ہی اندر اسے کھائے جا رہا تھا۔ ایک میٹھا سا درد۔۔۔۔ اور کرب جسے وہ آج بھی تنہائی میں پوری طرح محسوس کر لیا کرتا تھا۔ وہ اکثر اکیلے میں تڑپ اُٹھتا اور بڑبڑاتا۔

"اف ـــ! میری بھی کوئی زندگی ہے؟ نہ ماتا پتا کی شفقت نصیب میں نہ بہن بھائی کی محبت اور نہ کسی رشتہ دار کا سایہ حاصل ہے۔۔۔۔ مجھے کیا حق ہے جینے کا۔ زندہ رہنے کا جب کہ میری حالت ایک سوکھے پیڑ سے کم نہیں ـــ میرے سب کے سب سہارے چھوٹ گئے ہیں۔"

اُس نے ایک سرد آہ بھری اور اُس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی آواز اس کے

کانوں سے جا ٹکرائی ۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کی غمگین نگاہیں اپنے شکوے کی تاک میں نیلے آکاش کی وسعتوں میں گھورنے لگیں اور نظریں طواف کرتے سامنے والے مکان کی دوسری منزل کی کھڑکی پر رک گئیں ــــ یکایک اس کے خیالات نے پلٹا کھایا اور اس کے تن من میں ہلکی سی لہریں دوڑ گئیں ---- ۔ وہ بھولی بھالی صورت جسے وہ جی بھر کے ابھی دیکھ بھی نہ پایا تھا اس کے سامنے سے ہٹ گئی ــــ مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں کبھی نہ مٹنے والی یاد چھوڑ گئی ۔ ویسے اس مکان میں کرنل انل رائے کی بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ قیام پذیر تھی ۔ اس کا لڑکا انجینرنگ کی ٹریننگ حاصل کرنے باہر چلا گیا تھا ۔ پھر اس مکان میں یہ لڑکی کون تھی؟

وہ دیر تک پُر اُمید نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ۔ مگر ایک نازک سے بازو کے جس نے کھڑکی کو بند کر دیا اسے کچھ اور دکھائی نہ دیا۔

اگلے روز چھٹی تھی کرشن گھر پر ہی رہا ۔ کرنل رائے کے نوکر راموداد سے پوچھنے پر جانکاری ہوئی کہ کوئی پروفیسر رہنے کے لیے آیا ہے ۔ ایک انجانی کشش تھی جس نے کرشن کو گھر پر رہنے پر مجبور کر دیا ۔ ایک تڑپ تھی جس نے اس کی نظریں پھر کھڑکی پر جما دیں آخر وہ کون تھے ــــ ؟ تفصیلات میں جانے کی اس نے ضرورت نہ سمجھی ۔ وہ دنیاوی الجھنوں سے بہت دور تصورات کے سمندر میں غوطہ زن تھا ۔ اور جذبات کی رو میں ایک تنکے کی طرح بہے جا رہا تھا ۔ اس کی آنکھیں برابر کسی کی تلاش میں کھڑکی پر منجمد تھیں ۔

آخر کافی دیر بعد کرشن کی اُمید بر آنے لگی اور کھڑکی کو جنبش ہونے لگی، اس کی نگاہیں یکایک کھڑکی سے ہٹ کر صحن سے چھوتی ہوئی ہوا پر تیرنے لگیں اور پھر دیوار کے دشوار راستوں کو طے کرتی ہوئی اپنی منزل مقصود پر جا لگیں ۔ اس نے نیم وا کھڑکی میں آنکھیں دیکھیں جن میں ایک چاہ تھی، التجا، تھی ۔

دفعتاً ایک انجانی خوشی کے باعث کرشن کا چہرہ کھِل اُٹھا تھا ۔ اس کے ہونٹوں پر مسرت رقص کرنے لگی ۔ دل و دماغ پر پُر فضا کیف طاری ہو گیا ۔ اور

چاروں طرف سے اپنے ہی اپنے دکھائی دینے لگے۔ مگر وائے رے قسمت! فوراً ہی ایک دلدوز آواز نے اس کی تمام خوشیاں چھین لیں۔ اسے کسی کے سسک سسک کر رونے کی آواز سنائی دی اور وہ آنکھیں چند آنسو منڈیر پر گرا کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں —

گیتا کی سسکیاں اس کے ماں باپ کے لیے قیامت سے کم نہ تھیں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی پر دنیا کی ہزار نعمتیں قربان کرنے کو تیار تھے۔ اس کا ایک ایک آنسو ان کے تباہ کن سیلاب سے کہیں زیادہ بھیانک تھا۔ گیتا تو ان کا واحد سہارا تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" بے قرار کملا نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا — گیتا خاموش تھی۔ مگر حسرت بھری آنکھوں سے سامنے کی میز پر پڑی اپنے بھائی کی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ ارجن دیو اور کملا بھی گیتا کے درد کو بھانپ چکے تھے اور وہ بھی اپنی بیٹی کے غم میں شریک ہو گئے۔ باہر سے کسی کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ ارجن دیو نے آنسو پونچھ لیے۔ آواز لمحہ بھر کے لیے رکی۔ اور پھر شروع ہوئی۔ لیکن اب یہ پہلے سے مختلف تھی۔ اب کوئی دبے پاؤں واپس جا رہا تھا۔

ارجن دیو کے قدم دروازے کی طرف اٹھ گئے۔

"کون ہے —؟"

"جی! میں ہوں —"

"تو آئیے نا — واپس کیوں ہو لیے —؟"

ایک بار پھر وہ قدم اوپر کی طرف بڑھے۔ ارجن دیو نے ایک انجان صورت کا ہاتھ تھام لیا اور کمرے کی اداس فضا ختم ہو گئی۔

"فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں —؟" ارجن کا یہ فقرہ رسمی تکلف سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا تھا۔ وہ خود شرافت کا پتلا تھا۔ اس کے ہمدردانہ برتاؤ نے کرشن کو بے تکلف ہونے میں کافی مدد دی اور بولا۔

"فرمائیے! بے تکلف!!"

"سب سے پہلے میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے یہاں آنے کی جرأت اس لیے ہوئی کہ میرے دل میں سچائی تھی۔ میں واپس اس لیے لوٹا تھا کہ آپ کی طبیعت سے ناواقف تھا۔"

کرشن اتنا کہہ کر رک گیا۔ یہاں تک پہنچ جانے کے باوجود اس کے دل کی دھڑکن میں تیزی تھی۔

"آپ رک کیوں گئے۔ جو کچھ کہنا ہے، بے دھڑک ہو کے کہیے"؟

ارجن دیو کی زبان پھر کام کر گئی۔

"ابھی ابھی میں نے یہاں کسی کی سسکیوں کی آواز سنی تھی وہ کون تھی اور کیوں رو رہی تھی ــــــ؟"

کرشن ایک سانس میں کہہ تو گیا ــــــ مگر اس کا جسم نامعلوم خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ کمرے میں پہلے کا سا ماحول پھر طاری ہو گیا۔ ارجن دیو کے چہرے پر اداسی چھا گئی ــــــ کملا سوچ میں پڑ گئی اور گیتا پردے کے اندر کچھ لجا سی گئی۔

"یہ ہماری بیٹی گیتا تھی۔ شاید آپ ایک بہن کے جذبات کو نہ سمجھ سکیں جس کا بھائی عین جوانی کے عالم میں بچھڑ گیا ہو۔ اور جیسے آج کے روز دنیا میں ماتا پتا سمیت سب غیر دکھائی دے رہے ہوں"۔

یہ سنتے ہی کرشن کا دل زار زار رونے لگا۔ گیتا میں بہن کا پیار ٹپکتا نظر آیا ــــ اسے بار بار بھیا بلاتی نظر آئی ــــــ کرشن نے گیتا کو ٹھیک پہچان لیا تھا۔ وہ ایک بھائی کی محبت کی متلاشی تھی۔ کرشن کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے اور وہ بے اختیار چلا اٹھا۔

"گیتا میری بہن ہے۔ گیتا کا غم میرا غم ہے۔ مجھے اپنا بیٹا مان لیجیے۔ میری کوئی بہن نہیں، ماں نہیں، باپ نہیں، میں آپ ـ ـ ـ ـ ـ ـ"

کرشن نے اپنے ہاتھ ایک بھکاری کی طرح پھیلا دیے اور ارجن دیو کملا

کے دل رحم سے بھر گئے، ارجن نے بے اختیار آگے بڑھ کر کرشن کو گلے لگا لیا۔

گیتا کی آنکھوں میں مسرت و انبساط کے آنسو چھلکنے لگے۔ اس کا دل خوشی کے مارے بلیوں اُچھلنے لگا۔ اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"بھیا ——— !" اور اپنے دوپٹے کا آنچل پھاڑ کر کرشن کی کلائی کو سجا دیا۔ یہ بظاہر ایک راکھی تھی جو ایک بہن نے بھائی کو باندھی تھی۔ در حقیقت یہ محبت تھی جسے اپنی لاانتہار بلندیوں پر ناز تھا۔

لاغر کملا کا سر فخریہ انداز میں اُٹھ گیا۔ چہرہ دمکنے لگا۔ اور فرطِ محبت میں کرشن کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور سب کے سب باتوں باتوں میں ایسے گھل مِل گئے جیسے کرشن اسی گھر کا فرد تھا۔

وقت گزرتا گیا اور ساتھ ساتھ یہ بہن بھائی کا رشتہ بھی گہرا ہوتا گیا۔ کرایہ پر لیا فلیٹ چھوڑ کر سب کے سب کرشن کی پرانی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔

اتنے بڑے شہر میں ایک مکان میں رہنے والوں کو ایک دوسرے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ یہ گھرانہ لوگوں کی مشکوک نگاہوں سے بچا رہا کرشن کی زندگی اب گھریلو زندگی بن چکی تھی۔ اس کے لیے اب ماں باپ یا بہن کی کمی نہ تھی۔ کملا اور ارجن دیو اب بیٹی اور بیٹے کے ماں باپ تھے اور گیتا مالو خوشیوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ وہ دن بہ دن نکھر رہی تھی۔ اس نے ماتا پتا کے لیے ایک فکر پیدا کر دی لیکن پروفیسر کے لیے اپنی بیٹی کا رشتہ تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ لہذا گیتا کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ ویسے تو شادی کے معنی خوشی کے ہیں۔ لیکن گیتا اور کرشن جن کے لیے بھائی اور بہن کے پیار کا آغاز ہی ہوا تھا اس شادی کے خیال سے تڑپ اُٹھے۔

گیتا کا اُداس چہرہ دیکھ کر ماں کچھ کہے بغیر نہ رہ سکی اور اس کی ممتا بھری زبان کام کر گئی۔

"دو مہینے بعد میری گیتا پرائی ہو جائے گی۔"

گیتا سُن نہ سکی۔ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

کرشن کا دل بھر آیا۔ اسے گیتا سے بے پناہ محبت تھی، گیتا بستر پہ مُنہ کے بل پڑی رو رہی تھی۔ اور تکیہ سیمابی موتیوں سے مالا مال ہو رہا تھا۔ کرشن نے گیتا کو سہارا دیا۔

"پگلی!" اس کے منہ سے بہ مشکل ایک تھرتھراتی ہوئی آواز نکلی اور گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک کر گیتا کے ماتھے سے چمٹ گئے۔

آخر وہ دن آگیا! گیتا سچ مچ پرائی ہو گئی۔ کرشن نے بہن کو گود میں اُٹھا کر پالکی میں بٹھا دیا۔ پالکی سے چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کملا اور ارجن دیو بار بار اپنے آنسو کو پونچھ رہے تھے۔ اور کرشن کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

پالکی اُٹھائی گئی —— کرشن کی پُرنم نظریں دور تک پالکی کا پیچھا کرتی رہیں —— اور پھر وفورِ غم و اضطراب میں ماتا پتا کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے توسط یہ اصلیت سامنے آگئی کہ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے نگلنے سے نیلم جان کی موت واقع ہوئی تھی ۔!

اس کی لاش کو زمین کے سپرد کیے کچھ روز ہی بیت چکے تھے کہ انور کو ڈاک سے ایک لفافہ موصول ہوا۔ چاک کرتے پر نیلم جان کا خط پایا۔ جو اس نے موت کے فرشتے سے بغل گیر ہوتے سے قبل پوسٹ کر دیا تھا۔ نفس مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

" پیارے انور ـــــ ! سلامت رہو۔

مجھے اس بات کا احساس بجا طور پر ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔ کیوں کہ میں نے تمہاری محبت کا ۔ ۔ ۔ ۔ گلا گھونٹنے میں پہل کر دی۔ تمہاری خواہشات کے محل مسمار کرنے کی حماقت

کی اور تمہاری مسرتوں، و خوشیوں کے نشیمن میں آگ لگادی تم
مجھے اب بھی کوستے ہو گے۔

لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ میں ایسا سب
کچھ کرنے پر مجبور تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب جب کہ اس بے وفا دنیا سے
سدا کے لیے کنارہ کشی اختیار کرنے کا قصد کر لیا ہے چاہتی ہوں
کہ تمہیں حقیقت حال سے باخبر کردوں تاکہ دل و دماغ پر پڑے
بوجھ کو کچھ ہلکا کر سکوں۔ بصورت دیگر تم زندگی بھر مجھے کوستے
رہو گے۔ مجھے ایک گنہگار ہی تصور کرو گے جیسے اس دنیاوی عدالت
نے کیا ــــــ انور بیٹے تمہیں غالباً یاد ہو گا کہ تمہارے
والد تحصیلدار صاحب کا گورکھپور میں دوران قیام بیگم
صاحبہ مہلک عارضہ کا شکار بن گئی تھی۔ بیگم صاحبہ
- - - - - - یعنی تمہاری ماں کے اصرار پر مجھے تمہاری
رکھوالی کے لیے ملازمہ کا درجہ حاصل ہوا۔ تمہاری عمر چار پانچ
سال کے لگ بھگ تھی۔ میں تمہیں بہت چاہتی تھی، اور پھر
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحصیل دار صاحب نے میری
جانب دست شفقت دراز کرنے کے ساتھ دست درازی
سے کام لینا شروع کر دیا ــــــ میں نے پہلے پہل اپنی
بساط کے دائرے میں رہ کر دامن بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔
لیکن انہوں نے طرح طرح سے میری بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی
بابت اقدام اٹھائے اور جب بیگم صاحبہ کو مقامی سینی ٹوریم میں داخل
کرنا پڑا میرا بنگلہ میں بے وقت جانا آنا ہوا! اس دوران
تحصیل دار صاحب نے چاپلوسانہ انداز اپنائے مجھے اپنے
دام میں پھانس لیا۔ میں واویلا بھی نہ کر سکی۔ دراصل اس خود

غرض دنیا میں غریب اور بے کس ہونا بھی بذات خود ایک پاپ ہے۔ تحصیلدار صاحب یعنی تمہارے ابو نے طرح طرح کے حربے اپنائے مجھے بے بس کر دیا ـــــ اور ایک روز نہ چاہنے کے باوجود بھی میں نے وہ گوہر گراں مایہ کھو دیا جس کی حفاظت میں دل و جان سے کرتی آئی تھی ۔

مجھے ہر طرح سے دلاسہ دیا گیا اور روشن مستقبل کی ضمانت دی گئی ۔ غرض تحصیل دار صاحب نے اپنی ہوس کا شکار بنائے میرے جذبات سے کھیلنا اپنا معمول بنالیا۔

اتنے میں بیگم صاحبہ رو بہ صحت ہو کر بنگلہ کو آباد کر گئیں اور پھر تحصیلدار صاحب کا گورکھپور سے تبادلہ ہوا۔ ان دنوں میری حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ میں ماں بننے والی تھی اور پھر شہر چھوڑنے سے قبل تحصیلدار صاحب نے مجھ سے ملنے کی زحمت اُٹھائی۔ آنے والے مہمان کو پالنے کی خاطر کچھ رقم بھی مجھے دے دی ۔

وہ لوگ چلے گئے بنگلہ میں چوکیدار ستار میاں قیام پذیر تھے۔ پھر راحت کا جنم ہوا ۔ ساتھ میں یہ دل سوز خبر ستار میاں کے وساطت سے ملی کہ تحصیلدار صاحب کی ایک ایکسی ڈنٹ میں وفات ہو گئی ۔ غرض تمہارے ابو کے اس جہاں سے اُٹھ جانے کے بعد میری مصیبتوں کا دور شروع ہو گیا۔ لے دے کے وہی ایک سہارا تھے جیسے موت نے جنگل میں لیے میرے آگے بڑھنے کی راہیں مسدود کر دیں ۔

ایک لاوارث بچے کے ساتھ جینا دوبھر بن گیا تھا اب تو جان پہچان کے لوگوں کے ساتھ ساتھ ستار میاں بھی

مجھ پر انگلیاں اُٹھانے اور فقرے کسنے لگے —— پھر جب کسی شریف آدمی نے از راہ انسانیت میری جانب دست شفقت دراز نہیں کیا اور مصائب کے سائے مجھے ہر دم تڑپانے لگے تو بستی کی سب سے بدنام ذات "گلا بو جان" نے مجھے سہارا دیا۔ اسی ماحول میں راحت نے پرورش پائی اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔

ایک روز گلا بو جان بھی اس جہاں کو سدا کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ اور مرنے سے قبل سارے گر مجھے سکھا گئی۔ غرض وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بدنام بازار میں میرے علاوہ راحت کا نام بھی مشہور ہونے لگا۔

تم تعلیم مکمل کر کے اور بیگم صاحبہ کی رحلت کے بعد بنگلہ کو آباد کر گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس بابت مجھے علم ہوا میں نے بچپن کی وابستگی کے باعث تم سے ملنا چاہا، لیکن اپنی موجودہ حیثیت نے ایسا کرنے سے باز رکھا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر تم بدنام شخص شیرو کی صحبت میں کوٹھے پر آنے لگے۔

شیرو نے مجھے بتایا کہ تم راحت میں دلچسپی لینے لگے ہو۔ میں نے کوشش کی کہ تم اس دلدل میں نہ پھنسو اور طرح طرح سے تمہیں باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ اُتری —— تم زیادہ سے زیادہ راحت کی طرف جھکنے لگے۔

اس روز میرے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی جب شیرو کی وساطت تم نے راحت کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ میں نے راحت کو اس بابت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پگلی بھی تمہیں دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔

میں اصلیت کا انکشاف کرنے سے کتراتی اور کون تھا جو میری روئیداد پر یقین کر لیتا۔ میرے منع کرنے کے باوجود تم دونوں ایک دوسرے کو والہانہ طور سے چاہنے لگے۔ تم راحت کو اس بدنام بستی سے لے کر اسے وہ مقام دینے کی بابت سوچنے لگے جس مقام کی تمنا ہر لڑکی کیا کرتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں تذبذب میں تھی ـــــــ!

ماضی کے سارے واقعات میرے سامنے رقص کرنے لگے۔ ۔ ۔ ۔ میں اس شادی کے لیے ہاں کیسے کرتی؟ ۔ ۔ ۔ پھر تم دونوں نے مرنے مارنے کی دھمکی دے کر مجھے وسوسے میں ڈال دیا ـــــــ سراسیمگی و پریشانی کی حالت میں غرق میں نے شادی کے لیے ہاں کر دی۔

تم شادی کی تیاریاں کرنے اور سامان وغیرہ خریدنے کے لیے شیرو کے ساتھ شہر چلے گئے۔

اور میں راحت کو خوب موزوں انداز میں سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگی۔ لیکن کامیابی نہ ملی۔

وہ اس گندی اور بدنام بستی اور ماحول کو خیر باد کہنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

جب ہر طرف سے مایوسی کے گھٹا ٹوپ سایوں نے میرے قدم میں ناکامی کی بیڑیاں ڈال دیں تو میں نے تذبذب و اضطراب کے عالم میں کھانے کے ساتھ زہر ملا کر راحت کی زندگی کا سلسلہ منقطع کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

میں نے سب کے سامنے اور پھر عدالت میں اپنے جرم کو تسلیم کر لیا ـــــــ اور بدلے میں عمر بھر کے لیے قید ہو گئی۔

۔۔۔۔ اِس دوران میں نے شیرو کے ذریعہ تم سے ملنے
کی خواہش ظاہر کر دی ۔ لیکن تم عدالت یا جیل میں مجھ سے
ملنے کے لیے نہیں آئے
تم مجھے برابر گناہگار اور قاتل ہی سمجھتے رہے ۔
انور بیٹے ! اب جب کہ میں نے اس دنیا سے سدا
کے لیے چلے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے تم سے التماس کرتی ہوں
کہ مجھ ابھاگن کو معاف کر دینا ! میں نے جو کچھ بھی کیا اچھا ہی کیا
۔۔۔۔ ورنہ راحت کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے کر میں جس
گناہ عظیم کا مرتکب ہوتی، اس کی سزا میری روح کو مرنے کے
بعد بھی برداشت کرنی پڑتی ۔ کہیں تمہارا خاندان بدنام نہ ہو جائے
میں نے اصلیت کو سینے میں چھپایا ۔۔۔ ۔ زہر کے گھونٹ
پی لیے ـــــ لیکن اب تم پر حقیقت ظاہر کر کے مجھے ایک
سکون سا حاصل ہو رہا ہے ۔

تمہاری گنہگار
نیلم جان ـــ"

خط کی گدازیوں میں جھانکنے انور کو بہت دُکھ ہوا ـــــ اس کے تن من
میں سراسیمگی کی لہر دوڑنے لگی ـــــ چہرے کا رنگ اُڑنے لگا ـــ وفور درد
والم میں وہ پاگلوں کی صورت کچھ بڑبڑاتے لگا ۔ کچھ دیر بعد وہ غیر ارادی طور بوجھل
قدموں سے قبرستان کی طرف بڑھنے لگا ـــ جہاں راحت اور نیلم کی قبریں تھیں،
اس کے بعد انور کو کسی نے بھی نہ دیکھا ۔ نہ جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

—●●●—

فرض اور محبت

وسط مئی کی جان لیوا تمازت کا ہدف بنے پاس پڑی فائلوں کے ڈھیر سے نپٹ کر میں ڈاک سے موصولہ کاغذات کی ورق گردانی میں محو تھا کہ چپراسی کمرے میں گھس کر معصوم انداز میں چلایا۔

"جناب! دو عورتیں آئی ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

دو عورتیں ـــــــ اور دفتر میں میرا اُن سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ میں نے چپراسی سے اس نسبت پوچھ تاچھ کرنا مناسب نہ جانتے ہوئے اندر چھوڑ نے کو کہا ـــ

دیکھتے ہی دیکھتے دو عورتیں برقعہ پوش کمرے میں گھس گئیں۔ ایک معمر قسم کی سفید برقعہ میں ملبوس تھی اور دوسری لکھنوی انداز کا سیاہ رنگ کا برقعہ پہنے

نوجوان عورت لگتی تھی ۔ میں کچھ جاننے کی چاہ میں زبان کھولنے ہی والا تھا کہ بوڑھی عورت کہہ اُٹھی ۔

" یہ میری بیٹی ہے صفیہ ، بی، اے پاس کر لیا ہے ۔ اور ٹائپ بھی جانتی ہے ۔ کوئی بڑا بیٹا نہیں اور خود بیوہ ہوں ——— ! خدا کے لیے اسے کسی کام پر لگا دیجیے تاکہ ہمارا گزر ہو سکے ۔"

" لیکن ہمارے یہاں کوئی جگہ خالی نہیں اور ہاں نوکری کے معاملے میں آپ کو متعلقہ بورڈ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا ——"

میں یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر کہہ گیا ———

" وہاں درخواست دے دی ہے تین ماہ گزر گئے، لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا ۔ اب خدا کے لیے ہماری مدد کیجیے ———"

اب کی بار لڑکی کی زبان کام کر گئی ۔ اور ساتھ میں اپنے برقع کا دایاں بازو وا کر کے اس نے واضح انداز میں اپنے بے مثال حُسن کی نمائش کر دی ۔

مرعوب ہوئے بغیر میں نے معاملہ ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کہ " ہمارے یہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے ۔ پھر بھی وہ بڑے صاحب سے مل لیں، ممکن ہے وہ کچھ مدد کر سکیں "۔ خود میں کاغذات میں کھونے لگا ۔ نہ جانے کس اثر کے تحت ماں بیٹی ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں یکے بعد دیگرے کمرے سے نکل گئیں ۔

دن گزرے اور کچھ ہفتے بیتے

دفتر میں کام کی بہتات ہے ——— اِس اُس طرح کے معاملات سننے اور وابستگان کو تسلی بخش جواب دینے میں دن کا بیشتر حصہ گزر جاتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے کچھ حواریوں کے سروں پر سیاست کا بھوت بُری طرح سوار ہے ۔ ان کی بک بک میں بھی کچھ وقت ضائع ہو جاتا ہے ۔

اس لیے کام سے نپٹنے کی خاطر کبھی کبھی چھٹی کے روز بھی دفتر آنا پڑتا ہے ۔ آج تیرہ ۱۳ جولائی تھی ۔ شہیدوں کی یاد میں منانے والا دن ———

سننے میں آیا ہے کہ سنہ ۱۹۳۱ء میں اسی روز ڈوگرہ راج کے کرتا دھرتاؤں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی یاداش میں کچھ لوگوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کیے گئے تھے۔ اس روز عام تعطیل رہتی ہے اور شہیدوں کی روحوں کو ثواب پہنچانے کی نیت سے ان کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی رسم ادا کی جاتی ہے میں اس روز دفتر آیا تھا۔ اکیلا ——— چوکیدار دفتر کھولے کسی ذاتی کام سے چلا گیا۔

میں کام میں مشغول تھا کہ وہی سیاہ برقع پوش لڑکی کمرے میں داخل ہو گئی اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

"یہاں کس لیے آئی ہو؟ آج تو چھٹی کا دن ہے۔"

جواب میں لڑکی نے برقع کا اگلا پٹ پیچھے کی جانب پلٹ دیا اور دلکش آنکھوں سے معصومانہ انداز میں مجھے گھورنے لگی۔

"میں نے آپ کی ماں سے کہا تھا کہ بڑے صاحب سے مل لو۔"

"اسے تو کل شام کو بنگلہ پر ملے تھے۔" اتنا کہہ کر اس نے ہینڈ بیگ سے ٹائپ شدہ درخواست نکال کر میری جانب دراز کر دی۔ جو بڑے صاحب نے میرے نام مارک کر دی تھی۔

میں درخواست پڑھنے میں محو تھا کہ دفتر میں کام کرنے والے کلرک عبدالقادر کمرے میں آدھمکے۔ اسے دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دِقّت در پیش نہ آئی کہ انہی کے کہنے سے ہی صفیہ چھٹی کے روز مجھ سے دفتر ملنے آئی ہے۔

"یہ بہت غریب لڑکی ہے احمد صاحب! چھوٹے بہن بھائی ہیں اور بوڑھی ماں ——— اسے کام دے کر اجر عظیم کمائیے۔"

قادر برجستہ کہہ گیا۔ اور میں نے اس موضوع پر زیادہ بولنا مناسب نہ جانتے ہوئے لڑکی سے دو روز بعد آنے کو کہا۔

لڑکی کے چلے جانے پر عبدالقادر نے پھر صفیہ کو کام دینے کی سفارش زور و شور سے کر دی۔

دو روز بعد صفیہ کا ٹیسٹ لیے اسے عارضی طور پر ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام پر لگا دیا گیا۔ بہت ہی شرمیلی لڑکی نظر پڑتی تھی۔ بولتی بہت کم تھی اس کی یہ کم بولنے کی عادت مجھے پسند تھی۔

ابھی ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ سننے میں آیا کہ عبدالقادر صفیہ کے ساتھ دفتر سے چھٹی ملنے پر پھیرا کرتا ہے۔

میں نے پہلے اس قصے کو ان سنا کر دیا۔ لیکن بات آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ اور میں نے ایک روز کمرے میں بلا کر قادر سے اس بابت پوچھ تاچھ کی۔

"احمد صاحب! میں اتنا کمینہ نہیں ہوں کہ صفیہ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کروں۔ میں تو صفیہ کو اپنی بہن تصوّر کرتا ہوں۔ اب اس رشتہ کے ناطے ہم ایک دوسرے سے کھل کر بات بھی نہیں کر سکتے۔"

عبدالقادر کی اس یقین دہانی کے بعد میں نے معاملہ کو طول نہیں دیا۔ کچھ ماہ گزرنے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ صفیہ میں اب وہ پہلے جیسی شرم و حیا نہیں رہی تھی۔ اب وہ ہر ایک کے ساتھ آزادی کے ساتھ باتیں کرتی تھی اور گاہے گاہے کسی نہ کسی بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی تھی۔ میں اس کی غیر متوقع تبدیلی پر حیران ہوا اور ایک روز صفیہ کو بلا کر اس کے مستقبل کی بابت اِستفسار کیا تو وہ کہنے لگی ــــ

"احمد صاحب! میں اپنی زندگی بنانے سنوارنے کی بابت کیسے سوچ سکتی ہوں جب کہ میرے کاندھوں پر ایک ضعیف العمر ماں، چھوٹی دو بہنوں اور ایک چھوٹے بھائی کا بوجھ آن پڑا ہے۔ ابا حضور کی رحلت کے بعد اب میں ہی اُن کا واحد سہارا ہوں میں ہی ان کی زندگیوں کو خوشگوار موڑ سے وابستہ کر سکتی ہوں۔ میں تو ماں کے لیے بڑا لڑکا بننا چاہتی ہوں۔ ان حالات میں اپنی خوشی یا راحت کی بابت سوچنا بھی میرے لیے گناہ سے کم نہیں۔"

یقین کیجیے، صفیہ کے اس درجہ شُستہ اور اُونچے خیالات جان کے مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ اس کے ارادوں میں اس طرح کی موزوں لچک پاکر میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ایسی لڑکیاں ہر گھر میں جنم پا جائیں تو مانگ جلی عورتوں کو درد و کوفت سے واسطہ نہ پڑے۔

جب بھی صفیہ کو دفتر کے کسی ساتھی نے زندگی بنانے کا مشورہ دیا تو وہ بگڑ بیٹھی۔ ماں اور بھائی بہنوں کی خوشنودی اور درخشاں مستقبل کے تصوّرات میں غرق وہ اپنی حسرتوں کے چراغ کو گُل کرتے لگی۔

ویسے اگر دیکھا جائے تو صفیہ کی عمر جوانی کے اس دہلیز پر کھڑی تھی جہاں کوئی ایک ہاتھ نہ تھامے تو گرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جذبات کا گلا گھونٹے صفیہ ایک فاتح کی طرح فرض کی راہ پر گامزن تھی ــــــــ میرے دل میں اس کے لیے عزّت و احترام بڑھ گیا۔

ابھی مشکل سے چھے ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ ایک روز دفتر گھستے ہی سننے میں آیا کہ صفیہ نے شادی رچالی ہے۔ وہ بھی اپنے مُنہ بولے بھائی عبدالقادر کے ساتھ دونوں نے عدالت میں جا کے "سول میرج" کو ترجیح دی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نوکری کو خیر باد کہہ کر صفیہ خاوند کے ساتھ سری نگر چھوڑ کر جموں چلی گئی ہے۔

یہ بھی سننے میں آیا کہ دونوں کو کسی فرم میں کام ملا ہے۔ صفیہ نے چپ چاپ قادر سے منسلک ہو کر گھر کے ساتھ ساتھ اس وادی کو خیر باد کہنے میں اپنی عافیت جان لی۔

اس کے بعد صفیہ اور عبدالقادر سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن اس وقت میرے تن من میں آگ سی لگ گئی جب کہ یہ خبر ملی کہ اس کے چھوٹے بھائی کو چھوٹی سی چوری کرنے کے عوض میں جیل جانا پڑا۔ بوڑھی ماں گھر گھر بھیک مانگا کرتی ہے۔ اور چھوٹی بہنیں یتیم خانہ کو آباد

کر گئیں ہیں ——!

گو اس واقعہ کو ہوئے قریب ایک سال گزر گیا ہے لیکن اب بھی اکثر اکیلے میں سوچا کرتا ہوں کہ عبدالقادر کو یہ جتانے کی کیا ضرورت تھی کہ صفیہ اس کے لیے بہن کے برابر ہے۔ صفیہ کیوں کر اپنے فرائض سے تغافلی اپنائے ایک ایسا راستہ اپنا گئی جس کے باعث اس نے چار زندگیوں کو تباہ و برباد کر دیا ——!

آخر صفیہ کے ارادوں میں یہ کمزوری کیوں کر سما گئی؟ کیوں کر اس کے فرائض کی مورتی پاش پاش ہو کے رہ گئی؟

سوچتا ہوں کہ:۔

راولپورہ ہاوسنگ کالونی شہر سری نگر کے بہت قریب واقع ہے اور اس بستی میں زیادہ تر امیر لوگوں نے رہائشی بنگلے تعمیر کیے ہیں۔ یعنی آزادی حاصل کرنے کے بعد ہی ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرتے والوں کی بستی کچھ برس قبل یہ ایک گاؤں تھا۔ شہر کے ہنگاموں سے الگ تھلگ اور ہر طرح کی آشائش سے بے نیاز ــــ مگر اس علاقے کے غیر آباد زمین کے بڑے حصے کو گورنمنٹ نے حاصل کر کے ہاوسنگ اسکیم کے تحت کام میں لایا۔ ویسے پلاٹ تو ان لوگوں نے ہی حاصل کر لیے جن کے کشکول بھرے تھے یا پھر جو صاحب رسوخ اور ارباب اقتدار کے رشتہ دار تھے۔ بائی پاس سڑک تعمیر کرنے کے ساتھ ساتھ ریسرچ لیبارٹری انڈسٹریل

اسٹیٹ، انڈین آئل کا یونٹ اور دیگر اداروں کی وجہ سے اس بستی کی قدر وقیمت میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے۔

راولپورہ چوک کے آگے پرانے ہوائی اڈے کو جاتے والی پختہ سڑک کے ملحق "حکیم باغ" کے نام سے ایک گاؤں آباد ہے۔ جہاں ڈاکٹروں، انجینروں، وکیلوں اور تجارت پیشہ لوگوں کے عالی شان بنگلوں کے علاوہ غریب کسانوں کی کچھ جھونپڑیاں اب بھی موجود ہیں۔ یہ فلک بوس کوٹھیاں ان غریبوں، مسکینوں کا مانو مذاق اڑا رہے ہوں ـــــــ حکیم باغ میں اب بھی یاسیت کے نقوش واضح انداز میں نظر آتے ہیں۔ دن بھر کچھ غریب لوگوں کے ادھ ننگے بچے گلی کوچوں میں پھرتے رہتے ہیں ـــــ

راولپورہ اور حکیم باغ میں قیام پذیر وقت کے امیر مگر دل کے غریب لوگوں نے اپنے بچوں کو ہدایت دی ہے کہ ان وقت کے ستائے بچوں کی صحبت اختیار نہ کریں۔ جیسے وہ آدم زادے نہ ہوں ـــــــ خیر! راولپورہ جنرل روڈ سے وابستہ عالی شان بنگلہ میں درباری صاحب رہتے ہیں۔ وہ پیشے سے انجینیر ہیں۔ ان کی بیگم کو کتے پالنے کا شوق جنون کی حد تک ہے ـــــ

ان دنوں بیگم درباری کے پاس تین مختلف قسم کے کتے ہیں۔ ایک کا نام سولو ہے۔ یہ کتا کسی انجینر ساتھی نے نیوزی لینڈ سے لا کر دیا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ سفید دائرے بڑے ہی دلکش لگتے ہیں۔

دوسرے کا نام ڈکی ہے، اسے درباری صاحب کے ٹھیکیدار دوست اشفاق صاحب نے لداخ سے خاص طور اپنے لیے منگوایا تھا۔ مگر بیگم درباری نے ایک نئے انداز سے اس کتے کو "تحفتہً" مانگ لیا تھا اور اشفاق صاحب انکار نہ کر سکے۔

تیسرا کتا وکی ہے جو درباری صاحب نے خاص طور سے اپنی بیوی کو شادی پر عنایت کیا تھا۔ یہ کتا دراصل میاں بیوی کے ملاپ کی نشانی تھا۔

محبت کی یادگار ــــــ اس لیے بیگم درباری اسے بے حد پیار کرتی تھی۔ وکی بسا اوقات بیگم درباری کے ساتھ میز پر کھانا کھاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ سو بھی جایا کرتا تھا۔

درباری صاحب کی چار منزلہ کوٹھی کے قریب مہاراجی اینٹوں والا ایک ادھیڑ عمر مکان بھی ہے۔ اس میں مولوی اسحاق صاحب رہتے ہیں جو مقامی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مولوی صاحب کے مکان کے پچھواڑے سے غریبوں کی بستی شروع ہوتی ہے۔ اس بستی کے وسط میں ایک مزدور عبدالرزاق اپنی بیوی راحت اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ کچھ امیر گھرانوں کے برتن صاف کرنے پر راحت کو کچھ رقم وصول ہوتی تھی ورنہ عبدالرزاق کی مزدوری سے گھر کا خرچہ برداشت کرنا ناممکن تھا۔

اس دن عبدالرزاق صبح سے ہی بخار میں تپ رہا تھا۔ کیا کریں اس کی لاچارگی نے جاڑے کی پرواہ بھی نہیں کی ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ برابر کام پر جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے طبیعت اور بگڑ گئی۔ لیکن آج اس کی ہمت بھی جواب دے رہی تھی۔ جب وہ بسبب مجبوری جھونپڑے سے باہر آیا تو اسے چلا ہی نہ گیا۔ اس لیے مجبوراً اس نے بیوی راحت کو ہی اپنی جگہ کام پر بھیج دیا ــ سامنے ہی ایک کارخانہ کی بلڈنگ بن رہی تھی۔

ادھر بیگم درباری نے وکی کو حسب عادت اپنی مخصوص آواز میں یاد کیا۔ وکی دم ہلاتا ہوا اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لیکن اور دنوں کی طرح اس نے پلیٹ میں منہ نہیں دیا ــــ وہ بیگم درباری کی گود میں آکر خاموش بیٹھ گیا ــــ وکیؔ کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ بیگم نے وکی کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا لیکن وکیؔ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی حرکتوں سے بیگم درباری پریشان ہو گئیں۔

کتےؔ کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر بیگم نے فون کر کے درباری صاحب کو دفتر سے بلایا ــــ درباری صاحب کے آنے پر وکی وہیں فرش پر لیٹ

گیا۔ اور شام ڈھلتے ہی اس کے منہ سے لمبی لمبی سانسیں نکلنے لگیں وکّی کی طبیعت وقت گزرنے کے ساتھ گر رہی تھی۔ ادرک والا قہوہ پلایا۔ اس کے جسم کو حرارت پہنچانے کی کوشش کی گئی لیکن افاقہ نہ ہوا۔ بیگم کا اضطراب بھانپتے درباری صاحب نے ڈاکٹر مودی کو فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب ڈسپنسری میں نہیں ملے وہ کوٹھی جاچکے تھے۔ کوٹھی پر فون کیا تو علم ہوا کہ وہ کلب سے ابھی واپس نہیں آئے ہیں ـــــ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔

وکی کی سانس اکھڑی جارہی تھی اور وہ ہلکے ہلکے اب چیخنے بھی لگا تھا۔ درباری صاحب جلدی سے برزلہ روڈ والے ڈاکٹر جاوید کی طرف لپکے۔ ڈاکٹر صاحب کو بلانے کی ضرورت نہیں پڑی، کیونکہ وہ برآمدے سے وابستہ ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے تھے۔ عبدالرزاق مزدور کی بیوی اس کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا سہاگ بچا لیجیے۔ ان کا سارا جسم توے کی طرح تپ رہا ہے، ان کی حالت ابتر ہے۔ وہ چل بھی نہیں سکتے۔ تھوڑی سی دور گلی کے نکڑ تک جانا ہے چلیے نا ـــــ ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر جاوید نے قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" بند کرتے ہوئے زبان وا کردی۔

"تم سے ایک دفعہ کہہ دیا نا کہ میرے آرام کرنے کا وقت ہے۔ اس وقت میں کسی مریض کو دیکھنے نہیں جاسکتا۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

اتنے میں درباری صاحب گھبرائے ہوئے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے ان کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب استقبال کے لیے کھڑے ہوگئے۔

"درباری صاحب! آپ اس وقت کیسے ـــــ؟"

"میرا کتا وکی بیمار ہے۔" درباری صاحب جلدی سے بولے۔

"اوہ ـــــ! میں ابھی چلتا ہوں" ـــــ یہ کہہ کر ڈاکٹر جاوید نے ناول میز پر رکھ دیا۔ اور تشخیص (فسٹ ایڈ) بکس اٹھا کے درباری صاحب

کے ساتھ چل پڑے۔

راحت یہ سب دیکھتی رہی۔

بیگم درباری نے وِکی کو بستر پر لٹا دیا تھا اور خود اس کے سرہانے اُداسی و مایوسی کا مجسمہ بنی بیٹھی ہوئی تھی ـــــ ڈاکٹر جاوید نے آکر وکی کا معائنہ کیا اور کچھ توقف کے بعد کہے!

"جہاں تک میرا خیال ہے اس کی نس میں ہڈی کا چھوٹا سا ٹکڑا اٹک گیا ہے۔ جس کی وجہ سے خون کے دوران میں رکاوٹ سی آگئی ہے۔ اس کا فوراً ایکسرے ہونا چاہیے۔"

درباری صاحب نے بیگم کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ بیگم کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

فوراً وِکی کو کار میں رکھا گیا اور پھر کچھ دیر بعد کار ایکسرے ایکسپرٹ ڈاکٹر خزانچی کی کوٹھی کے سامنے رُک گئی۔

رزاق کی بیوی راحت ڈاکٹر جاوید کی بے رخی و بے مروتی سے لبریز سلوک کے سبب چیخ اُٹھی۔ مرے مرے انداز میں وہ ڈاکٹر ٹھسُو کے بنگلے کا رُخ کر گئی۔ اس خیال کو دل میں بسائے کہ شاید اس کے دل میں تھوڑی انسانیت باقی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ اُس کے سہاگ کو بچانے کی کوشش کرے ـــــ یہی ایک تنہا اُمید تھی۔ کیوں کہ آس پاس میں ڈاکٹر ٹھسُو ہی تھے۔ جس کی بابت راحت کو علمیت تھی۔

ڈاکٹر صاحب سونے کی تیاری میں تھے۔ راحت نے اُس کے پیروں پر پڑ کر فریاد کی۔

"ڈاکٹر صاحب میرے شوہر کو بچائیے۔ اس کی حالت بخار کی وجہ سے ابتر ہے۔ جسم توے کی طرح گرم ہے۔ ایک انسان کے ناطے میرے ساتھ چلیے۔ میں آپ کی شکر گزار رہوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو۔"

کہتے کہتے راحت کا گلا بھر آیا ——

" دیکھو رات کافی بیت چکی ہے ۔ یہ مریض دیکھنے کا نہیں بلکہ آرام کرنے کا وقت ہے ۔ تم مریض کے سر پر برف کی ٹوپی رکھو ۔ بخار کم ہو جائے گا ۔ کل سویرے ڈسپنسری میں لے آنا ۔" اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب اندر گئے ۔

راحت اُلٹے پاؤں گھر کی طرف چل پڑی ۔ راحت بے کسی کا لبادہ اوڑھے سوچنے لگی کہ اب برف کی ٹوپی کہاں ملے گی ۔ پریشان حالت میں اُس نے گھر کا رُخ کیا —— راستے میں مولوی صاحب کے دروازے پر دستک دی کچھ دیر بعد مولوی صاحب خود باہر آگئے ۔

" کیا بات ہے ——؟"

" مولوی صاحب میرے شوہر بخار میں تپ رہے ہیں ۔ حالت بہت خراب ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے برف کی ٹوپی سر پر رکھنے کو کہا ہے ۔ اگر برف کی ٹوپی ہو تو دے دیجیے ۔ صبح واپس کر دوں گی ۔"

مولوی صاحب غصے میں کسمساتے —— " اری نامعقول ! اس معمولی سی بات کے لیے میری نیند حرام کرنے کی تم نے جرأت کیسے کی —— جاؤ ! دفع ہو جاؤ —— ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ماتھے پر رکھ دو بخار اُتر جائے گا ۔"

اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے لاپرواہی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا ۔ راحت مایوس ہو گئی اور اُلٹے پیروں واپس لوٹ گئی ۔

عبدالرزاق شکستہ حال کھاٹ پر بے سکت پڑا تھا ۔ دونوں کم سن بچے کچھ دور بیٹھے اپنے باپ کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ۔ دکھ و اضطراب نے ان کی حالت ابتر بنا دی تھی ۔

راحت زیادہ دیر عبدالرزاق کے پاس نہ بیٹھی ۔ برف کی ٹوپی کا خیال آتے ہی وہ سیدھی بازو والی کوٹھری میں گئی اور صندوقچی میں ہاتھ ڈالا ۔ اس کے ہاتھ میں کچھ روپے آگئے ۔ اور ریزگاری بھی —— یہی کچھ بس اس کی کل پونجی

تھی ۔ اب یہ لوٹی کہاں سے خریدے اور پھر اتنی رات گئے اب کوئی دکان بھی کھلی نہ ہو گی ۔ مولوی صاحب کا کہا یاد آیا اور ٹھنڈے پانی میں تر کیا ہوا کپڑا عبدالرزاق کے ماتھے پر رکھتی گئی ۔ مایوسی کے بحرِ بے کراں میں غرق اسے اور کوئی راستہ سوجھائی نہ دیا تھا کہ اچانک عبدالرزاق پر کھانسی کا دورہ پڑا اور پہلی بار اس کے منہ سے خون کا فوارہ نکل کر ننگے فرش پر پھیل گیا ۔

راحت خون دیکھ کر چلا اُٹھی بچے سہم گئے اور ماں کے ساتھ چمٹ گئے ! راحت اپنے شوہر کی بگڑتی ہوئی حالت بھانپ کر تڑپ اُٹھی ۔ عبدالرزاق سے بات کرنی چاہی لیکن اس کا جسم بے جان پڑا تھا ۔

آنکھیں پتھرا گئیں تھیں ۔ راحت اچانک اُٹھی اور دم سکت اپنے شوہر کے کپکپاتے ہونٹ اور کھلی آنکھیں بند کر دیں ــــــ سامنے پڑی پھٹی چادر میں عبدالرزاق اپنے زندگی کے ساتھی کا ٹھنڈا جسم ڈھک دیا ۔ غم و اندوہ کی تصویر بنے اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکلی ۔ آنکھیں خشک جیسے آنکھوں کے چشمے بھی سوکھ گئے ہوں ــــــ دونوں بچے پاس میں بے سُدھ پڑے تھے ۔

اُدھر وکی کا ایکسرے لیا گیا ۔ اس کے دائیں پھیپھڑے میں جانے والی نس میں ایک ہڈی کا ٹکڑا اٹک گیا تھا ۔ جلد سے جلد آپریشن کرانے کی ضرورت تھی ۔

"افسوس کی بات ہے درباری صاحب کہ میں کتّوں کے نسوں کا ماہر نہیں ہوں ۔ ایک ماہر ڈاکٹر ہی یہ آپریشن کر سکتا ہے ۔"

ڈاکٹر نے مایوسی سے کہا ۔

"پھر کون ہے اس کے ماہر ــــــ ؟"

درباری صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا ۔

"شہر میں تو کوئی نہیں ہے ۔ البتہ دہلی میں اس کا آپریشن موزوں انداز میں ہو سکتا ہے ۔"

سراسیمگی و افراتفری کے عالم میں غرق درباری صاحب واپس گھر آگئے ۔

بیگم درباری کو سارا واقعہ سنا دیا۔ اسے بہت دُکھ ہوا اور وفورِ غم سے اس کی حالت ابتر ہوگئی۔ "میرا دِکی ــــــ اسے بچائیے ــــــ یہ میری جان ہے۔"

صبح سویرے مسز و مسٹر درباری دکی کو دہلی لے جانے کے لیے کار میں ہوائی اڈے کی طرف چل پڑے۔ آگے جانے پر راولپورہ چوک میں ان کو دوسری گاڑیوں کے ساتھ رکنا پڑا۔ آگے تابوت میں عبدالرزاق کی لاش رکھی ہوئی تھی اور مولوی اسحاق نماز جنازہ پڑھانے کی تیاری کر رہے تھے۔

فقط دکھاوے کے لیے اور انسان ہونے کا ثبوت دینے کی غرض سے اڑوس پڑوس کے کچھ احباب نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ ان میں ڈاکٹر جاوید بھی تھے۔

کچھ دور سڑک کے کنارے راحت بچوں سمیت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اپنی شکستہ تقدیر پر ماتم کر رہی تھی محلے کی کچھ عورتیں راحت کو دلاسہ دے رہی تھیں ــــــ اور حقیقت میں اس اُجڑے گھرانے کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔

نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد میت کو قبرستان لے گئے اور دیگر گاڑیوں کے ساتھ درباری صاحب کی کار بھی فراٹے بھرتی ہوئی ائرپورٹ کی طرف چل پڑی۔

اُف تفریق کی کس قدر گھناونی تصویر ہے یہ اس دنیا میں اشرف المخلوقات یعنی انسان کی قدر و قیمت کچھ بھی نہیں۔ ہاں ہاں اس بگڑے سماج میں صرف دولت، عہدہ اور بڑا نام ہی انسان کی پہچان رہ گئی ہے۔ ایک غریب اور قلاش آدمی کی وقعت ایک کتے سے بھی بدتر ہے۔ جیسے بےبس اور وقت کے ستائے لوگوں کو جینے کا حق نہ ہو۔ گویا وہ انسان نہیں بلکہ اس دھرتی کے پاپ ہوں۔

امیر اور غریب لوگوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنا اب ناممکن سا بن گیا ہے۔ یہ انسانوں کی طبقاتی دوری آگے چل کے اخوت و رواداری کے ساتھ ساتھ انسانیت کے روشن چراغوں کو گل کرنے میں کامیاب اُترے گی ــــــ اور حضرت آدمؑ کی اولاد کی ہستی اس اندھیرے میں سدا کے لیے نیست و نابود ہو کر رہ جائے گی۔

کاش ــــــ! ہمیں اس اصلیت کا احساس ڈس لیتا ــــــ! ٭٭٭

بانکے بہاری

رات بھر لگاتار بارش کی وجہ سے جھونپڑے اور برآمدہ کی حالت نال سی بن گئی ہے۔ بانکے جھونپڑے کے پچھواڑے میں دراز ہے۔ بے حس اور حرکت اس کا ماتھا اور نتھنے پھولے ہوتے ہیں۔ اور کنپٹی میں سے اب بھی رس رس کے خون بہہ رہا ہے۔

رامو اور سیتا دونوں بانکے کی تیمارداری رات بھر کرتے رہے۔ لیکن افاقہ نہ ہوا۔ علی الصبح مندر کی گھنٹیاں بجنے کے ساتھ ساتھ رامو نے سیتا سے پانی کی دیگ گرم کرنے کی تلقین کی اور خود پاس والی پہاڑی سے آک کے پتے و بنفشہ کے شگوفے لینے چلا گیا۔ پتوں اور شگوفوں کو دیگ کی نذر کر کے پانی کچھ دیر تک اُبلتا رہا۔ اور پھر گئے رات کی طرح گرم گرم پٹیاں بانکے کے گھائل جسم پر کی گئیں

انہوں نے بڑی کوشش کی کہ بانکے کی حالت سُدھر جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سیتا اندر ہی اندر گھٹی جاری ہے اور رامو بانکے کے قریب بیٹھے اپنی بدبختی پر رو رہا ہے۔ کچھ دور بڑا بہاری گم صم کھڑا ہے اور اس کی نظروں کا نشانہ اس کا ساتھی بانکے ہے۔ بانکے کے ساتھ بہاری نے بھی کھانا پینا ترک کر دیا ہے۔

رامو کے سامنے گئے گزرے واقعات ایک ایک کر کے رقص کرنے لگے کس طرح سے بانکے نے زمین کے ٹکڑے کو سڑک کی زد میں آنے سے بچا لیا تھا۔ سرکاری اہل کار مشینیں اور مزدوروں کو لے کر اس پہاڑی علاقہ کو شہر جانے والی بڑی شاہراہ سے ملانے کی بابت سڑک کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اس لنک روڈ کی زد میں رامو کے تین بیگھے زمین کا بہت بڑا حصہ آ رہا تھا۔ رامو سرکاری اہل کاروں اور ٹھیکیداروں کے حواریوں کے سامنے گڑگڑایا اور منتیں کیں کہ اسے زمین کے اس موروثی ٹکڑے سے محروم نہ کیا جائے۔ لیکن اس کی آواز اور آہ و زاری صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اور جب ٹریکٹر زمین کو ہموار کرنے کی غرض سے چالو کیا گیا تو بانکے یہ سب کچھ نہ دیکھ سکا۔ زمین کو زد میں لینے سے قبل ہی اس نے ٹریکٹر کے روبرو کھڑا ہو کے احتجاج کا علم بلند کیا۔

ٹھیکیدار کے کہنے پر اسے ہٹانے کی غرض سے خوب پیٹا گیا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں۔ لیکن بانکے ہر ایک وار سہتا رہا اور ٹریکٹر کے اگلے حصے کے ساتھ بار بار اپنا سر مارنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بانکے کا ماتھا لہو لہان ہو گیا۔ اس دوران سرکاری کرم فرما آ گئے اور بانکے کی حالت بھانپتے ہوئے انہوں نے رامو کی زمین سے ملحق زمیندار کے کھیتوں میں سے راستہ نکالنے کے احکامات موقع پر ہی صادر کیے۔

رامو کی زمین بچ گئی۔

بانکے کی محنت بار آور ثابت ہوئی لیکن اس کی اپنی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ رامو اور سیتا کی انتھک خدمت بانکے کو نہ بچا سکی۔

سورج چڑھتے ہی بانکے نے آنکھیں کھولیں۔ بہ مشکل گردن اٹھائے

اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ مالک اور مالکن سے نظریں ہٹائے اپنے سال ہا سال کے ساتھی بہاری کو حسرت بھری نگاہوں سے گھورنے لگا۔ جو برابر آنکھوں سے خون بہائے جارہا تھا۔ لحظہ بہ لحظہ بانکے کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ اور جسم برف کی طرح سرد پڑ گیا۔

بانکے کی دائمی جدائی نے بہاری کی حالت غیر سی بنادی۔ بھوک پیاس سے غافل وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ اور دن رات برآمدہ سے وابستہ مچان کے نہہ خانہ میں بے سُدھ پڑا رہا۔ جیسے جینے کی خواہش مر گئی ہو۔ بانکے کی یاد کو ویسے فراموش کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ جب کہ راموکے پاس ایک دوسرے کی رفافت میں انہوں نے ۹ سال سے کچھ اوپر کا عرصہ گزارا تھا۔ طویل عرصہ ساتھ میں صرف کیا تھا۔ راموکوئی تین سال اکیلا ہی بانکے بہاری کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ان کی وابستگی میں رامو نے خوش حالی سے لبریز زندگی میں لچک پیدا کرنے کی بھرپور کوششیں کی تھیں۔

ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے پر سیتا نے بھی بانکے بہاری کی جانب دست اعانت دراز کیا۔ کچھ روز میں وہ دونوں اپنی مالکن سے بھی گھل مل گئے۔ جیسے سیتا کسی پرائے گھر سے نہ آئی ہو۔۔۔ ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بیت گئے لیکن سیتا کی گود خالی رہی۔ اس کا احساس رامو کو چھوڑ کر بانکے بہاری کو بھی واضح انداز سے ڈسنے لگا۔ بانکے کے بچھڑ جانے کے چند ہفتوں بعد سیتا کی حالت غیر متوقع طور پر گرنے لگی۔ اسے رہ رہ کر چکر آنے لگے۔

ایک شام وہ کھلیان کی صفائی کرنے گئی۔ رامو کا دل مارے خوشی کے اچھلنے لگا۔ جب کہ اسے درگا مائی نے یہ خبر سنائی کہ سیتا ماں بننے والی ہے۔

رامو نے سیتا سے التجا کی کہ وہ سخت محنت نہ کرے، وہ زیادہ تر اسے گھر میں بٹھاتا رہا۔ اب سیتا کھیتوں میں جا کر پتی کا ہاتھ بٹاتے یا پہاڑی پر سے لکڑی کا گٹھا لاتے سے رہ گئی۔ یہ کام اب رامو کو اکیلے ہی کرنا پڑتا۔ ادھر سیتا

کی حالت غیر اور ادھر بانکے کے غم میں بہاری سوکھ کر کانٹا ہو چلا۔ اس کی حالت میں کسی طرح کا تفاوت نہ آئی۔ گو رامو نے بہاری کا دل رکھنے کے لیے ہزار ہا جتن اپنائے لیکن بے سود۔ دراصل بہاری اپنے عزیز ترین ساتھی کی جدائی برداشت نہ کر سکا۔

آخر کار کھیت کو قابل کاشت بنانے کی غرض سے اور بہاری کے دل سے ساتھی کا غم فرو کرنے کی خاطر رامو نے گوپال چاچا سے اس کا موتی مستعار لیا لیکن پھر بھی بہاری کا دل کام میں نہ لگا۔

جب لاکھ سمجھانے پر بھی بہاری نے موتی کا ساتھ دینے میں حامی نہ بھری تو رامو نے مجبوراً بہاری پر ہاتھ اٹھایا ـــــ سامنے چیڑ کے درخت کی جھکی شاخ توڑ کے اس نے بہاری کے ڈھیلے کمر کی چاندماری شروع کر دی رامو مارتا گیا۔ بہاری جواب میں آنکھوں سے آنسو بہائے ایک جگہ ساکت رہا۔

رامو کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوا اور پھر سامنے والے کھیت میں کام کرنے والے کرتار کے کہنے میں آکر رامو نے پھر سے بہاری پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ کوڑے پر کوڑا مارتا گیا۔ پر بہاری اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھا۔ اور پھر مار کھا کے وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ دفعتاً بہاری نے منہ سے خون کے لوتھڑے اگل دیے رامو پریشان ہوا ـــــ پانی کی چھینٹیں بہاری کے چہرے پر دیں۔ لیکن حالات میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہاری کا جسم پھیلتا گیا پھیلتا اور سرد پڑتا چلا گیا۔ اور پھر آخری ہچکی لیے وہ سدا کے لیے اپنے ساتھی بانکے کی نگری میں چلا گیا۔

رامو بچوں کی طرح رونے چلانے لگا۔ کرتار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اتنے میں سامنے جھاڑیوں میں سے گوپال چاچا کی آواز سنائی دی۔

"رامو بیٹے! گھر آجاؤ۔ سیتا نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔" رامو زندہ لاش کی صورت کھڑا رہا اور سوچنے لگا کہ بانکے نے جان دے کے اس کے موروثی زمین کے ٹکڑے کو سڑک کی زد میں آنے سے بچا لیا۔۔۔ اور اب بہاری نے اس جگ کو خیر باد کہنے سے پہلے اس کے گھر کے اندھیرے ماحول کو روشن چراغ سے نوازا۔

مالا ٹوٹی ..... دانے بکھرے

احمد کے دل کی گہرائیوں میں خوشی و مسرت کے شگوفے پھوٹ پڑے جب کہ اس کی والدہ رات کے پچھلے پہر اس بات کا اعلان غیر متوقع طور پر کر گئی کہ وہ رحمت اللہ صاحب کی اکلوتی بیٹی رضیہ کو اپنی بہو بنانے کے لیے تیار ہے۔

غرض سب سے بڑی رکاوٹ دو محبت بھرے دلوں کو ملانے کے سلسلہ میں دور ہو گئی تھی۔ ویسے احمد کے والد خاندانی آن بان کے شیدائی ہونے کے باوجود بھی نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے ان کے تعلقات بیٹے کے ساتھ دوستانہ تھے انہوں نے رضیہ اور احمد کی شادی کی نسبت بلا حیل و حجت حامی بھر لی تھی۔ لیکن احمد کی والدہ نے ایک نہ مانی تھی وہ اپنی ہٹ پر قائم رہی۔ حد تو یہ کہ احمد کے والد سیٹھ یعقوب بھی اپنی شریک حیات کے سامنے بھیگی

بلی بنے رہتے تھے۔ مگر احمد کی چاہت سے لبریز رویہ اور استحکامی نہج اپنانے کی وجہ سے مضبوط چٹان نرم پڑ گئی۔

شادی کی گھڑی جیسے جیسے قریب آگئی احمد اور رضیہ دونوں اضطراب و بے چینی کی آگ میں اندر ہی اندر جلتے رہے! فراق کے لمحات اب انہیں شاق گزرنے لگے تھے۔

آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کا انہیں بڑی بے قراری سے انتظار تھا اور جس گھڑی کو گلے لگانے کی نیت میں کتنی ہی راتیں انہوں نے جاگ کر کاٹی تھیں۔

دلہن کے لباس میں ملبوس رضیہ کو اپنے گھر میں پا کر احمد اتنا خوش تھا جیسے قارون کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔

لیکن اس کی یہ خوشی —— یہ بشاشت اس ذات پاک کو نہ بھائی —— تقدیر کے لکھے کون مٹا سکتا ہے!

شادی کے تیسرے روز ہی خوشیوں کے ہنگامے میں رضیہ بستر علالت پر دراز اپنی بدبختی کا ماتم کرتے میں غلطاں تھی۔

ڈاکٹر پر ڈاکٹر بدلتے گئے۔ لیکن اس مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوا اور بدلے میں حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار ڈاکٹروں نے ہمت ہار دی۔ حکیم ذکا اللہ نے کہہ دیا کہ دوا سے زیادہ اسے اب دعا کی ضرورت ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شادی کے چھٹے روز جب کہ رضیہ کو تندرست ہونے کی صورت میں اپنے والدین کے گھر جانا تھا اس نے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر قبرستان کا رُخ کر لیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ رضیہ کو اُمید ہی نہیں تھی کہ وہ احمد کو اپنے شوہر کے روپ میں روبرو پائے گی۔ شادی کی رسم ادا کرتے پر رضیہ کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔

بشاشت دوچند ہو گئی —— جس کی وجہ سے اس کے دل پر اثر

پڑا۔ اور پھر یہی خوشی حد سے تجاوز کر کے اس کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔
رضیہ تو اپنے سارے ارمان دل میں بسائے راہ خلد اختیار کر گئی۔
—— لیکن احمد کی حالت کسی زندہ لاش سے کم نہیں تھی۔ اسکی حیثیت اُس مُلاح کی سی تھی جس کی کشتی بیچ منجدھار میں پھنس کر سمندر کے سینے میں چھپی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہو —— اور وہ سمندر کی طوفانی موجوں کے رحم و کرم پر ہو ——

اس کی پاگلوں جیسی حالت کو دیکھ کر اس کے والدین کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ احمد ہر روز صبح و شام قبرستان جا کر رضیہ کی قبر کے پاس بیٹھ جاتا اور دیر تک اپنی بد نصیبی پر آنسو بہاتا رہتا۔ اس کی حالت واقعی کسی دیوانے سے کم نہیں تھی۔ دفتر جا کر بھی کام میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔

احمد کی اس افسردہ حالی کو ختم کرنے اور اس صدمۂ عظیم کو فراموش کرنے کی خاطر سیٹھ صاحب نے بیٹے کا تبادلہ سرینگر سے جموں کرا دیا۔
بڑی مشکل اور بڑی منتوں کے بعد احمد نے اس شاہی فرمان پر لبیک کہا۔۔ اپنے پیار کی نگری وادی لالہ زار کو خیرباد کہہ دیا۔۔۔۔۔ اور پتھروں کے شہر کا رُخ کیا —— گھر کے پرانے ملازم عبدالرحمٰن کو بھی اس کے ساتھ جانا پڑا ——
سیٹھ صاحب کے ذاتی رقعہ نے تیر بہدف کا کام کیا جو جموں میں وارد ہوتے ہی کسٹوڈین کا کوارٹر محلہ دلپتیاں میں بہ آسانی حاصل ہو گیا۔ جہاں احمد نے اپنے نوکر عبدالرحمٰن بابا کے ساتھ قیام کیا۔
صبح صادق حسب عادت احمد نے مسواک لے کر دانتوں سے چبانا شروع کر دی اور پھر اس کا گھردرا حصہ باہر پھینکنے کی غرض سے سامنے والی بند کھڑکی کھولی کہ ایک بجلی سے کوند گئی۔
اسے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں آیا —— اور گھبرا کر عبدالرحمٰن

بابا کو آواز دی ــــ رحمٰن بابا ابھی تک اپنے بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ احمد کی گھبرائی ہوئی آواز پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اور دوڑتا ہوا کھڑکی تک پہنچ گیا ــــ احمد نے انگلی کے اشارے سے عبدالرحمان بابا کو باہر کا منظر دکھایا۔

"چھوٹے مالک ــــ! یہ تو سو فیصدی رضیہ بیٹا ہی ہے۔"

عبدالرحمان بابا نے باہر کا منظر دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

رحمٰن بابا نے یہ جملہ اتنی اُونچی آواز میں کہا کہ دوشیزہ نے گائے کے بچھڑے کو چھوڑ کر احمد کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

وہ اپنے کام کو بھول کر ٹکٹکی باندھے احمد کو ہی گھورے جا رہی تھی۔

"موئے شرفو ــــ تیرا دھیان کہاں ہے ــــ؟ بچھڑے کو پکڑ ــــ"

یہ اس دوشیزہ کی ماں کی رعب دار آواز تھی جو گائے کا دودھ دوہ رہی تھی ــــ دفعتاً ماں کی آواز پر چونک کر اپنے دل پر ضبط کیے دوشیزہ پھر سے بچھڑے کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھی۔

لیکن احمد کے دل و دماغ پر ایک ہیجان سا بپا ہو گیا۔

رضیہ تو مر چکی ہے ــــ۔۔۔ اس کا بے جان وجود تو منوں مٹی کے نیچے دب کر رہ گیا ہے۔ تو پھر یہ لڑکی۔۔۔۔۔ کون ہے ــــ؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

لب و لہجہ، شکل و صورت اور قد و قامت وہی ــــ گویا رضیہ کی ہو بہو دوسری تصویر ۔۔۔۔۔

احمد کے ساتھ بوڑھے رحمٰن بابا کے ہوش بھی اُڑنے لگے اور سب سے زیادہ حیرت تو اس بات پر ہوئی جب خلاف توقع شرفو بھی احمد میں زیادہ دلچسپی لینے لگی ــــ

احمد کا اب یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ دفتر جانے سے قبل اور

شام کو دفتر سے واپس آنے پر شرفو کے مکان کی جانب کھلنے والی کھڑکی پر کھڑا ہو جاتا تھا بسا اوقات شرفو سامنے والی کھڑکی سے جھانکتی۔ کبھی اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی تو کبھی وہ کوئی کپڑا سیتی ہوئی نظر آئی ——— اور دونوں کی ——— نظروں کا تصادم ہوتا ——

اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دنوں کے بعد ایک شام کو شرفو رحمان بابا سے کہہ گئی کہ دودھ بازار سے خریدنے کے بجائے ان کے ہاں سے لے لیا کریں۔ کیوں کہ ان کے ہاں خالص دودھ ملے گا۔ بغیر ملاوٹ کے۔"

دن گزرتے گئے۔

بارہا احمد اور شرفو کا آمنا سامنا ہوا ——— لیکن دونوں ہی ازراہِ تشکر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ——— لیکن انہوں نے کبھی زبان سے کام نہیں لیا۔

شرفو سے تانک جھانک کا سلسلہ کیا شروع ہوا کہ احمد کو اطمینان حاصل ہو گیا۔ اب وہ کام میں پھر سے دلچسپی لینے لگے۔

ایسے یہ پھیکی پھیکی و بے سواد زیست پھر سے خوشگوار اور پُر فضا نظر آنے لگی۔ اس کی صحت بھی اب کافی سدھر گئی تھی۔

اس روز تو اس کی جان میں جان ہی آ گئی جب کہ شرفو نے اپنے نازک ہاتھوں سے ہلدی اور سونٹھ کا لیپ بنا کر اس کے ماتھے پر لگایا۔ گذشتہ تین روز سے احمد کے سر میں بہت درد تھا۔ اور باوجود علاج کے بھی درد میں افاقہ نہیں ہوا تھا۔ تین دن سے دفتر بھی نہیں جا سکا تھا۔ احمد کے دیدار نہیں ہوئے تو شرفو بھی گھبرا گئی تھی۔ اس نے رحمان بابا سے احمد کے بارے میں دریافت کیا تو رحمن بابا نے اسے بتایا کہ احمد گذشتہ تین دن سے سر کے درد میں مبتلا پریشان ہے۔

اصلیت معلوم ہوتے ہی شرفو ایک دم بے چین ہو گئی ———

وہ فوراً ہی دوڑتی ہوئی احمد کے کوارٹر میں آئی۔ اور ہلدی و سونٹھ کا لیپ بنا کر اس کے ماتھے پر لگا دیا۔

نرم و نازک ہاتھوں کی گرم گرم لمس نے احمد کی خوابیدہ رگوں میں جیسے نئی روح پھونک دی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اس کی نس نس میں زندگی رقص کرنے لگی۔ اس کے نیم مردہ دل میں پھر سے انگنت ارمان مچلنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ہزار خواہشوں کے باوجود احمد شرفو سے کچھ نہ کہہ سکا —— بلکہ ایک خاموش تماشائی کی طرح ٹکٹکی باندھے اس کے انگ انگ اور اس کی ایک ایک ادا کا جائزہ لیتا رہا۔

نہ جانے شرفو کے نرم و نازک سے ہاتھوں میں کون سا جادو تھا۔ ۔ ۔ ۔ کہ ماتھے پر لیپ لگاتے ہی احمد کے سر کا درد اس طرح کافور ہو گیا جیسے درد کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

اب احمد مزید صبر نہ کر سکا۔ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے شرفو کے نام ایک خط تحریر کیا اور دفتر جانے سے قبل اس خط کو شرفو تک پہنچانے کے لیے رحمان بابا سے بار بار تاکید کی۔

اس خط میں احمد نے شرفو کو صاف صاف تحریر کیا تھا کہ:

"تم ایک بار پہلے میری محبوبہ اور —— پھر میری ۔ ۔ ۔ ۔ شریک حیات کے روپ میں میری زندگی سے وابستہ ہو چکی ہو۔

پھر تم ۔ ۔ ۔ ۔ نوشتۂ تقدیر کے تحت مجھے بربادی کی چوکھٹ پر لا کھڑا کر کے اچانک غائب ہو گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور محبت کی وادی سے کنارہ کیے شہر خموشاں میں بسیرا کیا۔

شرفو ——! مجھے خواب میں بھی اُمید نہ تھی۔ کہ وادی لالہ و گل سے نکل کر اس پتھروں کے شہر میں تمہیں شرفو کے روپ میں پا لوں گا۔

یقین کر لو شرفو! رضیہ میں اور تم میں رتی بھر بھی فرق نہیں ہے،

تم نے میری مردہ حسرتوں کو ایک نئی زندگی بخشی ۔۔۔۔ اور ایک بار پھر مجھے زندگی کی راہوں پر لا کھڑا کر دیا ـــــ تم نے مجھے پھر سے زندہ رہنے کی قوت عطا کر دی ۔

کاش ـــــ! یہ ساتھ سدا کے لیے مل جاتا۔ پھر مجھے ـــــ

کاش ہم پھر سے ایک دوسرے سے وابستہ ہو جاتے ۔۔۔۔

ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ہمیشہ کے لیے شریک ہو جاتے ۔۔۔۔۔"

احمد کا خط رحمان بابا نے شرفو تک پہنچا دیا۔ لیکن اس کا نتیجہ احمد کی امید کے برعکس نکلا ۔

شام کو دفتر سے آنے پر احمد نے دیکھا کہ شرفو کے مکان کی کھڑکی بند پڑی ہے ۔ وہ بند کھڑکی کو دیکھ کر سخت تذبذب میں پڑ گیا ۔۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اچانک بے رخی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے ؟

شرفو ہر روز صبح و شام خود دودھ دینے کے لیے آیا کرتی تھی ـــــ لیکن اگلے روز وہ دودھ دینے بھی نہیں آئی ۔

رحمٰن بابا نے دودھ لینے کے بہانے سے شرفو سے بات کرنے کی کوشش کی ۔۔۔۔ لیکن جواب میں کچھ کہے بنا ہی شرفو نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

احمد شرفو کی موجودہ بے رخی پر سخت حیران تھا ۔۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا آخر میں نے کون سا گناہ کیا ہے ایک خط لکھ کر ـــــ کون سا جرم ۔۔۔ مجھ سے سرزد ہو گیا ہے ـــــ؟

وہ خود بھی تو حد سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لیتی تھی ۔

اس کی حالت ایک کٹی ہوئی پتنگ سی ہو گئی ۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ۔ وہ بار بار شرفو کو دیکھنے کی غرض سے کھڑکی کے پٹ کھول دیتا اور ہر بار اسے مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ۔

کچھ روز اسی تذبذب اور بے قراری کے عالم میں گزر گئے ۔

ایک روز احمد نے شام کو دفتر سے تھکا ماندہ گھر میں قدم رکھا تو عبدالرحمٰن بابا نے اس کو ایک پیکٹ لا کر دیا اور کہا کہ "یہ پیکیٹ شرفو بیٹا نے دیا ہے۔ اور وہ کسی عمر رسیدہ عورت کے ہمراہ ٹھری و ہیلر سے کہیں چلی گئی ہے۔"

احمد نے گھبراہٹ و اضطراب میں کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے بلکہ کرسی پر بیٹھ کر بے تابی سے پیکٹ کو کھولنے لگا۔

پیکٹ میں ایک خط سب سے اُوپر رکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی خط کو کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ خط میں شرفو نے لکھا تھا۔

" آپ نے میرے نام خط لکھا لیکن میں نے آپ کے خط کا کوئی جواب نہ دیا ——— آپ میری اس سرد مہری پر ضرور ناراض ہوں گے۔

لیکن کیا کروں؟ مجبور ہوں - - - - تقدیر نے ہم دونوں کے ساتھ ایک ایسا کھیل کھیلا ہے کہ اپنی برگشتہ بختی پر ماتم بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں ——— تو میں حقیقت حال سے آپ کو روشناس کرنے کی غرض سے یہ خط لکھ رہی ہوں۔

احمد صاحب! میری شادی ہو چکی ہے۔ میرا شوہر ملٹری میں بھرتی ہے۔ کل وہ محاذ سے چھٹی لے کر گھر آگیا ہے اور میں آج اپنی ساس کے ساتھ اپنے سسرال جا رہی ہوں!"

احمد صاحب ——— یقین کیجیے میں نے آپ کے اندر دلچسپی لی۔ آپ کی بیماری کے وقت آپ کی تیمارداری کی ——— اور آپ کے کافی نزدیک بھی آگئی۔ تو صرف اس لیے کہ ——— میرے شوہر کی صورت آپ کی صورت سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ بالکل اسی طرح ——.—— جس طرح میری صورت آپکی مرحوم بیوی سے ملتی ہے - - - - یہ قدرت کا ہم دونوں کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے - - - - -؟

میں اپنے شوہر کی تصویر، اس خط کے ساتھ ارسال کر رہی ہوں۔ دیکھ کر آپ کو خود ہی میری بات کا یقین آجائے گا۔"

احمد نے تصویر کو جلدی دیکھا تو سامنے اپنی ہی صورت دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔۔۔۔ ۔اور اپنی بد نصیبی پر ماتم کرنے لگا۔ دانہ دانہ یکجا کر کے احمد نے جو مالا تشکیل دی تھی وہ دفعتاً ٹوٹ گئی ـــــــ اور اس کے دانے لق و دق صحرا میں بکھرتے گئے۔
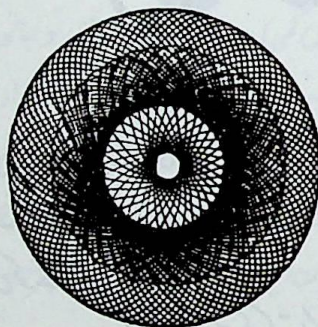
انمول تحفہ

"کیوں بیٹی! آج یہ فائلوں کا انبار پھر ساتھ لے آئی ہو؟"

"امی! سال کے آخری ایام چل رہے ہیں۔ حساب کتاب سے متعلق کتابیں اور رجسٹر مکمل کرنے ہیں۔"

"بیٹی ——— ! تم کو لڑکی ہو کر کتنا کام کرنا پڑتا ہے۔ کاش تیرا کوئی بھائی ہوتا! تو تمہیں اس قدر محنت نہ کرنی پڑتی ———"

"امی جان ——— ! پھر وہی رٹ ——— کیا مجھے پھر ناراض کرنے کا ارادہ ہے۔ کتنی بار کہوں ——— کیا لڑکیاں لڑکوں کی طرح کام دھام نہیں کر سکتیں ———؟

لڑکیاں تو اب ہر میدان میں آگے بڑھ گئی ہیں۔ اب لڑکی پہاڑ دیواری

میں مقید ہستی نہیں رہی ہے۔ آخر ہم لڑکیوں میں کیا کمی ہے ——؟"

"اچھا بیٹی! اچھا —— تو جیتی میں ہاری —— چل اب چائے پی لے —— اور پھر تھوڑا سستا لے۔ لگاتار دفتر اور پھر گھر میں فائلوں میں جھانکنے اور کاغذات کا مشاہدہ کرتے سے آنکھوں پر بُرا اثر پڑے گا۔"

"امی ——! تم خواہ مخواہ فکر کرتی ہو تمہاری بیٹی راشدہ کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

چائے پینے کے بعد امی نے موضوع سخن بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا —— "بیٹی تمہاری خالہ سویرے تمہارے دفتر جانے کے بعد ہی آئی تھی وہ ضد کر رہی تھی ——"

"امّی ——" راشدہ بات کاٹتے ہوئے کہہ اُٹھی —— "میں نے کہا نا کہ میں ابھی شادی کی بابت سوچ بھی نہیں سکتی اور پھر دانش ——! اُونہہ میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔"

"آخر دانش میں کمی کیا ہے؟ ذرا میں بھی تو جانوں ——؟"

"کمی کا سوال نہیں ہے امّی ——! میرے اور دانش کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

—— یقین کرو امی ——! میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی —— ہم دونوں کے درمیان ایک وسیع و عریض خلیج کھڑی ہے۔ جسے پاٹنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔"

"لیکن بیٹی ——! اب تو میرے ہاتھ سے تیر نکل چکا ہے میں نے کیا بلکہ - - - -۔ وفات پانے سے قبل تمہارے ابا مرحوم نے تمہاری خالہ کو زبان اس بابت دی ہوئی تھی —— کم از کم ان کی زبان کا تو خیال رکھو۔ کیا انکار سے کام لے کر تمہارے ابا جان کی روح کو آزار نہیں پہنچے گا۔ دانش ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اسے اپنی

ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔"

" امّی جی ـــــــ ! شادی گڈا گڈی کا کھیل نہیں ہے۔ دو جسموں کا ہی ملاپ نہیں ہے۔ بلکہ دو شخصیتوں اور دو روحوں کا بھی ملاپ ہوا کرتا ہے۔ اگر ہم دونوں کے سوچنے کے انداز میں اتنا بُعد ہے تو اندازہ لگائیں کہ لمبی چوڑی زندگی ایک ساتھ کیسے کاٹ سکیں گے ـــــ؟ میرے احساسات سے کھیلنے کی کوشش نہ کریں۔ خدارا میں کہیں کی نہ رہ جاؤں گی۔ میں مجبور ہوں امی ! ـــــــ کیا تم چاہتی ہو کہ...

... تمہاری اکلوتی بیٹی شادی کے بعد دکھوں اور مصائب کا ہدف بنی رہے؟ جب کہ ہم دونوں کے خیالات میں اتنا ہی تضاد اور اختلاف ہے تو ہم ایک دوسرے کی زندگی کا ہم پلہ کیسے ثابت ہوں گے ؟"

ـــــــ راشدہ ایک اچھی تقریر کر گئی۔

" بیٹی ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتی ہو ـــــــ لیکن میں کیا کروں؟ زبان دے گئی ہوں ـــــــ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ زبان دے کر مکرنا نہیں چاہتی۔ ـــــــ یہ مت بھولو کہ یہ خواہش تمہارے ابا کی تھی ـــــــ"

اتنا کہہ کر امّی باورچی خانہ میں چلی گئیں۔ اور راشدہ سوچنے لگی کہ اب کیا کچھ کس انداز سے ہوگا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ تلخ و ترش لمحات رقص کرتے لگے جو دانش کی شریک حیات بن جانے پر اُبھر سکتے تھے۔ اس معاملے کو مزید طول دینے کے بجائے وہ دفتر سے لائے گئے کاغذات کی ورق گردانی کرنے لگی۔

دانش میں سب کچھ تھا۔ وہ اسکوٹر فیکٹری کا مالک تھا۔ ڈیڑھ سو سے زائد لوگ اس کے کارخانے میں کام کرتے تھے۔ صرف ایک کمی تھی جو دانش اور راشدہ کے درمیان حائل تھی۔ وہ تھی تعلیم کی کمی ـــــــ

راشدہ ایم اے تھی اور اس کے برعکس دانش تین سال تک امتحان میں بیٹھنے کے باوجود میٹرک پاس نہ کر سکا۔ اس کمی کے باعث دونوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز میں بڑا فرق تھا۔

راشدہ کی چاہت یہ ہے کہ اسے ایک مہذب تعلیم یافتہ گھرانے میں جانا نصیب ہو ـــــ دانش کو فقط دولت جمع کرنے اور بنگلے تعمیر کرکے کرائے پر دینے کا بھوت سوار تھا ـــــ یہی ایک بڑی وجہ تھی کہ راشدہ اسے نہیں چاہتی تھی۔

اگلے روز راشدہ نے دفتر سے جلدی چھٹی حاصل کرلی اور خالہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھدیا۔ خالہ جمیلہ بیگم ایک شریف الطبیعت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے دل کی مالک تھیں۔

انہوں نے راشدہ اور دانش کے رشتے کی بات جیسے شروع کی تھی ویسے ہی خود اپنی طرف سے منقطع کردی اور ساتھ ہی دانش کے لیے دوسرے گھرانے میں بات چلا کے رشتہ پکا کردیا۔

دانش کی شادی کی تقریب میں راشدہ اور اس کی امی نے بڑھ کر حصہ لیا ـــــ راشدہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی کیوں کہ اس کی آرزو اور مراد بر آئی تھی۔

دانش نے اس معاملے میں تبادلہ خیالات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

موسم بہار کے جھونکے یادِ خزاں کے تھپیڑوں میں بدلتے گئے۔ بادام کے شگوفوں سے لدی پھندی ڈالیاں اب سوکھتی چلی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان درختوں کی نئی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔

وقت کتنا بے رحم ہوتا ہے، کسی ایک کا انتظار نہیں کرتا ـــــ

چار سال کا عرصہ اسی طرح بیت گیا۔ ان چار سالوں نے اپنے اثرات راشدہ کی زندگی پر چھوڑ دیے۔ جیسے انسان راستے سے گزر جاتا ہے تو پاؤں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ان چار سالوں میں راشدہ نے پانے کے بجائے بہت کچھ کھو دیا تھا۔ اس کی امی اس حسرت کو دل میں لیے دائمی نیند سو گئیں کہ بیٹی کے ہاتھ پیلے نہ کرسکی۔ اور پھر محمود سے راشدہ نے شادی رچالی

محمود گورنمنٹ ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا، اس کی غزلوں ونظموں کا مجموعہ چھپ چکا تھا۔ جس کے سوز وگداز میں جھانکنے پر راشدہ نے اسے دل ہی دل میں چاہا اور اپنا لیا تھا۔ محمود کے ساتھ میں رامپور جانے پر راشدہ کی نوکری بھی چلی گئی تھی۔ ان کی پھلواری میں ایک خوب صورت پھول کھلا ــــ منے کے آنے سے انہیں خوشیوں کا خزانہ مل گیا تھا۔ لیکن تقدیر کو یہ خوشی ایک آنکھ نہ بھائی ــــ

محمود بیمار رہنے لگے، کھانستے رہے۔ پہلے پہل تو راشدہ اور محمود نے معمولی بیماری جان کے توجہ نہ دی۔ لیکن اُس وقت راشدہ کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی، جب ڈاکٹروں نے بتایا کہ محمود تپ دق کے مریض ہیں۔

ڈاکٹروں کے مشورے کے تحت محمود کو ہوا کی تبدیلی کے لیے سینی ٹوریم میں داخل کرنے کے سبب شملہ آنا پڑا ــــ راشدہ نے مقامی کارخانہ میں اسٹینو کلرک کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور منے راشد کو K.G میں داخلہ مل گیا۔ راشدہ کو دانش کی خبر نہ تھی۔ البتہ خالہ جان کی وفات پر ان کے ہاں آخری بار جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

منے کو اسکول چھوڑ کے راشدہ تھرمس میں چائے لیے محمود کے پاس سینی ٹوریم گئی اور راستے میں ایک کانٹے دار جھاڑی میں سے ایک خوشنما سُرخ رنگ کا پھول کاٹ کر لے گئی جسے اس نے محمود کی قمیض کے کاج کی زینت بنا دیا۔

"راشدہ میں تم پر ایک بوجھ سا بن گیا ہوں۔ کتنا بدنصیب بن گیا ہوں ــــ کاش مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں محمود! نہیں ــــ ایسی باتیں نہ کرو کہ میرا دل ٹوٹ جائے! تمہارے اور منے کے سوائے میرا کون ہے ــــ؟ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو گا۔ فکر نہ کرو۔" ــــ راشدہ محمود کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوئی ــــ

آج کارخانے میں خوب چہل پہل تھی۔ کیوں کہ مینجنگ ڈائرکیٹر معائنہ کی خاطر آرہے تھے۔ جسے دیکھو ــــ صفائی سجاوٹ، یا کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا ہے۔ اتنے میں مینجنگ ڈائرکیٹر کے آنے کا بگل بجایا گیا۔ ہر ایک مزدور سے لے کر ملازم تک کارخانہ کے وسیع صحن میں جمع ہو کے دو قطاروں میں کھڑے ہوگئے کارخانہ کے اعلیٰ افسران اور کارکنوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے۔

راشدہ اپنی سہیلی ٹریسا کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی باتیں کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے میں محو تھی۔

"آپ کو صاحب نے بلایا ہے!" یہ چپراسی تھا۔

راشدہ حسب معمول پنسل و ڈکٹیشن پیڈ لے کے صاحب کے کمرے میں گئی ــــ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکیں اور دھڑام سے زمین پر گر پڑی ــــ مینجنگ ڈائرکیٹر اور کوئی نہیں بلکہ دانش تھا اس کا خالہ زاد بھائی ــــ

دانش بھی گھبرایا ہوا کرسی سے اُٹھا اور راشدہ کو اُٹھایا ــــ اسے اپنے ساتھ والے بنگلے میں لے آیا۔

"تم نے آخر کیوں مجھے غیر جان لیا۔ راشدہ! تم اس حالت میں تھیں تو کم از کم مجھے اطلاع تو کرنی تھی۔ میں ایک بھائی کی حیثیت سے تمہارا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔"

راشدہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی، اور پھر دانش کے خیالات میں اس قدر سنجیدہ پن اور پختگی دیکھ کر وہ حیران رہ گئی ــــ دوسرے روز واپس چلے جانے پر دانش نے راشدہ کو اپنے ساتھ گھر لانے کی ہر ممکن کوشش اپنائی لیکن راشدہ کی غیرت و خودداری آڑے آئی۔ وہ معاملہ ٹالتی گئی اور اپنے منے راشد اور محمود کے بارے میں بھی راشدہ نے دانش سے کچھ نہ کہا ـــ ـــ انسان جو چاہتا ہے کم ہی ہوا کرتا ہے۔

ایک جانب محمود، راشدہ اور اس کا منّا اور جینے کے لوازمات ان سے دور ــــ دوسری جانب دانش اور اس کی شریک حیات ـــ ! انہیں ہر طرح کی آسائش و آرام حاصل ہے لیکن ان کی پھلواڑی میں کوئی بھی پھول نہ کھلا ــــــ

راشدہ نے اپنے سرتاج کے علاج میں روپیہ پانی کی طرح بہایا لیکن خدائے برحق کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ایک روز محمود راشدہ و منّے راشد کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دارفانی سے چلے گئے ـــ ! راشدہ کی حالت روتے روتے دگرگوں ہوگئی۔ روز بروز اب اس کی صحت بھی جواب دینے لگی۔ حالت زیادہ خراب ہوتے پر اُسے کارخانہ سے وابستہ ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ اس کی صحت سدھرنے کی بجائے اور زیادہ بگڑ گئی اور مرنے سے قبل راشدہ نے منّے راشد کو سہیلی ثریا کے حوالے کر دیا اور ایک خط دانش کے نام دیا۔

ثریا راشد کو لے کر دانش کے پاس گئی اور راشدہ کا خط دے کر راشد کے بارے میں بتایا۔ دانش بچوں کی طرح سسک سسک کر رو اٹھا بچے کو سینے سے لگائے خط کی تحریر سے لرز اٹھا۔

" دانش صاحب !

میں تمہاری خواہش کے مطابق تمہاری زندگی میں شامل نہ ہو سکی۔ دراصل میری تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ میں تڑپتی رہوں، ترستی رہوں۔ اب جب کہ اس دنیا کو میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ جا رہی ہوں اپنے لختِ جگر راشد کو بھیج رہی ہوں۔ اس اُمید کے ساتھ کہ یتیم خانہ سے بڑھ کر آپ اس کی اچھی طرح پرورش کر سکتے ہیں۔ اگر راشد کو آپ نے اور میری سعیدہ بھابی نے اپنا لیا تو میں سمجھ لوں گی کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا اور اس طرح میری تڑپتی روح کو بھی چین مل جائے گا۔

بدنصیب

راشدہ "

خط پڑھ کر دانش پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"رونے سے کیا مرحومہ واپس آسکتی ہے دانش ــــ !
آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ جاتے جاتے وہ آپ کو ایک خوب صورت اور انمول تحفہ دے گئی ہے ــــــــ اپنے جگر کا ٹکڑا ــــ"

ثریا نے دلاسا دیا۔

"ہاں ہاں ! تم سچ کہتی ہو ثریا ! اس بڑے دل کی دیوی نے ہمارے گھر کو اس انمول تحفہ سے روشن و آباد کر دیا ہے۔"

سعیدہ نے دانش سے مُنّے راشد کو لے کر گلے سے لگاتے ہوئے کہا اور اسے پیار کرنے لگی۔

اور دانش حسرت بھری نظروں سے راشد کے چہرے کے معصومانہ نقوش میں اپنی کھوئی ہوئی بہن کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

انسانیت کی موت

جوق در جوق لوگ جن میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ تھی ۱۱ اپریل کو نمازِ جنازہ ادا کرنے کی خاطر وسیع و عریض پولو گراونڈ کی جانب چل پڑے۔ کچھ سینہ کوبی کر رہے تھے، کچھ نوحے پڑھ رہے تھے۔ کچھ بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہے اور کرۂ ارض فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔

"شہید بھٹو امر رہے۔

"مولوی لڈلہ کو ختم کرو!

"مقبوضہ کشمیر کو واپس کرو"۔

غرض ایک جم غفیر نے نماز ایک ساتھ ادا کی۔ بلالحاظ پارٹی اور مسلک کے ابھی نمازی فرائض سے فراغت پانے ہی والے تھے کہ باغ کے گوشۂ راست میں آگ کے شعلے بلند ہو گئے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ مشتعل ہجوم نے گرجا گھر کو آگ لگا دی ہے۔

"ارے بھائی! یہ خدا کا گھر ہے عبادت کے لیے وقف ہے اس کے جلانے سے کیا حاصل ہو گا ــــــ؟ اللہ سے تو ڈرو!"

میرے بغل میں کھڑے نیم معمر شخص کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس کے جواب میں ہجوم میں سے ایک نوجوان نے زبان وا کر دی۔

"گرجا گھر جلتا ہے تو جلنے دو۔ یہ عیسائی تو ہمارے نہیں بن سکتے ان سے ہمارا نباہ نہیں ہو سکتا۔ امریکہ کی شہہ پر یہ قیامت صغریٰ بپا ہوئی ہے۔ شہید بھٹو کا قاتل تارا مسیح بھی تو عیسائی ہے۔"

"مگر اس میں تارا مسیح کا کیا قصور ہے۔ وہ ایک ملازم ہے اور اپنے آقاؤں کا حکم بجا لایا کرتا ہے۔ اس میں گرجا گھر یا عیسائی مذہب کے ماننے والوں کا کیسا دخل ــــــ؟ کاش ہم جوش کے ساتھ ساتھ ہوش کو باقی رکھتے۔"

میں اس معمر شخص کی حمایت میں اتنا کہتا ہوا اپنے دوست انور کے ساتھ بھیڑ کو چیر کے آگے بڑھنے لگا۔ لال چوک کے پاس بڑے ہجوم نے ضیاءالحق کے پتلے کو نذر آتش کر دیا ــــــ ساتھ ہی ابوالکلام روڈ پر خاصہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ پاس جانے پر ایک غیر ملکی سیاح کو خون میں لت پت پایا۔

"ارے ان انگریز سالوں نے بھٹو کو مروا دیا ہے۔ ان شاطروں نے ہمیشہ ہمارے جذبات و احساسات کی نگری میں آگ لگا دینا اپنا فرض جان لیا ہے۔"

کوئی تقریر کرنے کے انداز میں بول رہا تھا اور چند بزرگ قسم کے لوگوں کی مداخلت کرنے پر اس انگریز چھوکرے کو آفت سے بچا لیا گیا۔ معاملے کی

نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے میں نے زبان کو مہر لگادی ۔

اگلے دن ساری وادی میں افراتفری کا بازار گرم ہوا ۔ انسانیت سوز واقعات دیکھنے کو ملے ۔ ہزار ہا واقعات میں سے ایک سانحہ مجھے تا زندگی یاد رہے گا جس کو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا اپنا فرض جانتا ہوں ۔

اعجاز ضلع اننت ناگ کے موضع بجبہاڑہ میں سکونت پذیر ہے ۔ اس کی شریک حیات اصغری پاس کے گاؤں اروِنی کے مولوی اشفاق کی دختر تھی ۔ اپنے علاقہ میں جب مولوی ٹولہ اور جماعت اسلامی کے خلاف لاوا پکتا گیا اور اس پارٹی سے وابستہ کچھ لوگوں کی پٹائی کی گئی تو اعجاز کے والدین نے مناسب جانا کہ بہو اصغری اور اس کے سات سالہ لڑکے عبدالرزاق کو ننھال بھیج دیا جائے ۔

اعجاز بیوی اور بچے کو والدین کی ہدایت پر اروِنی چھوڑ آیا ۔

مولوی اشفاق گاؤں کی مسجد میں پیش امام کے فرائض کے ساتھ ساتھ مقامی اسکول میں استاد تھے ۔ لیکن یہ حقیقت کہ اس موضع کے اکثر لوگ جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے ۔ بیوی اور بچے کو اپنے سسرال چھوڑ کر اعجاز بظاہر فکر سے آزاد ہو گئے ۔ لیکن دن ڈھلتے ہی سننے میں آیا کہ آس پاس کے علاقے میں مقیم ہزار ہا لوگوں نے اروِنی گاؤں پر حملہ کر دیا ہے ۔

افسوس ! ● ایک خدا

● ایک کتاب

● ایک قبلہ

● ایک رسول ؐ

اور ایک مسلک کے ماننے والے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے ۔ اسلام کے پیروکار اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں پیش پیش تھے ۔ اعجاز نے اس مذہبی منافرت کے خلاف کچھ کہنا چاہا کہ اسے پیٹا گیا ۔

"ارے سالے! تم نے بھی تو اس جماعت کی لونڈیا کو شریک حیات بنایا ہے"

لوگوں کا کہنا ہے کہ مسٹر بھٹو کو امریکہ کی شہہ پر فقط جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ قتل کا مقدمہ ایک ڈھونگ تھا۔ ایک کھیل تھا۔ نظام مصطفےٰ ﷺ ایک دکھاوا ——— دراصل وہ غریبوں، محنت کشوں اور مزدوروں کے ہمدرد و محسن جناب بھٹو کو ختم کر دینا چاہتے تھے، جماعت اسلامی اسلام کے دامن پر ایک داغ ہے، اس پارٹی کے کرتوت آر ایس ایس سے کسی طور کم نہیں، غرض جتنے منہ اتنی باتیں سننے کو ملتیں اور پاکستان کے خلاف لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں اس قدر نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا کہ کچھ شائستہ اور سمجھدار لوگ اصلیت سے باخبر ہونے کے باوجود زبان نہ کھول سکے۔ گو مسٹر بھٹو نے بھی دوران حکومت کچھ غلطیاں کی تھیں۔ لیکن کیا مجال کہ ان کا اظہار کر دیا جائے۔

ہاں تو ہجوم نے جہلم دریا پر تعمیر شدہ پل کو جو بجبہاڑہ اور اروَنی کو آپس میں ملاتا تھا آگ لگادی تاکہ کوئی آسانی کے ساتھ دریا پار نہ کر سکے۔ اس کے بعد جلتی ہوئی لکڑیاں ہاتھوں میں لے کر اروَنی گاؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا! شیطانی ہتھکنڈے پر پھیلانے میں پیش پیش رہے۔

آن واحد میں گاؤں کو مکمل طور پر آگ کی نذر کر دیا گیا۔ لوگوں کو مارا پیٹا گیا۔ اور تو اور ——— گاؤں کی مسجد تک کو خاکستر کر دیا گیا۔ املاک کے ساتھ ساتھ میوہ دار درختوں سے لبریز باغات کو تہس نہس کیا گیا۔

اعجاز نے جب یہ خبر سنی تو حواس باختہ اصغری اور عبدالرزاق کی یاد میں اروَنی کی جانب چل پڑا۔

کسی نہ کسی طرح دریائے جہلم کو پار کر کے شام گزرے جب کہ آگ کے شعلے ہر طرف بلند ہو رہے تھے وہ سسرال پہنچ گیا۔

مولوی صاحب کی کوٹھی تو پوری جل چکی تھی خود مولوی صاحب مار پیٹ اور اس حادثہ کی وجہ سے جان بحق ہو چکے تھے۔

اعجاز کی حالت ابتر تھی ـــــ وہ اور اس کی ہوشمندی ایک ساتھ ڈگمگانے لگی ۔ اس نے اصغری اور عبدالرزاق کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ۔ اِدھر اُدھر چیختے چلاتے لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے وہ گاؤں کے کھلیان میں جا پہنچا ـــــ جہاں گاؤں کی عورتیں اور بچے نوحہ خوانی کرنے میں محو تھے۔

ایک قیامت کا سماں تھا ۔

کچھ پر سکتہ طاری تھا اور کچھ عورتیں بت بنی بیٹھی تھیں اور جابجا انسانیت سوز اور حیوانیت سے لبریز واقعات بکھرے پڑے تھے ـــــ واقعہ کربلا کی یاد تازہ ہونے لگی۔ جہاں مذہب اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کو کلمہ گو حضرات نے بے سرو سامانی کی حالت میں رفقاء سمیت شہید کر دیا تھا۔ کھوجتے کھوجتے کھلیان کے ایک کونے میں اعجاز نے اصغری کو بے ہوشی کی حالت میں پایا ـــــ پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر مارے اصغری نے نیم مردہ آنکھیں واکیں ۔ اعجاز کو سامنے پا کر چلانے لگی ۔

" بھاگ جاؤ ـــــ بھاگ جاؤ اعجاز یہ لوگ تم کو بھی ختم کر دیں گے بھاگ جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابا حضور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اتنا کہہ کر اس نے آخری ہچکی لی ۔

لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد اعجاز غمزدہ واپس آ رہا تھا کہ قبرستان کے نکڑ پر چنار کے درخت پر سے رزاق کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ کچھ بچے بستی کی تباہی دیکھ کر خود کو بچانے کے لیے درختوں پر چڑھ گئے تھے ۔ تاکہ یہ بلا سے لبریز رات کسی نہ کسی طرح کٹ جائے ۔

افراتفری کی حالت میں اعجاز عبدالرزاق کو ساتھ لیے اپنے گاؤں کی جانب چل پڑا۔ اس کی حالت ایک زندہ لاش کی سی تھی۔ شکستہ اور بدحال ۔ اُمیدوں کے چراغ ایک ایک کر کے گل ہو چکے تھے ۔

اس کے قدم وفورِ غم سے ڈگمگانے لگے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا،

افسوس انسان نے حیوانیت کا لبادہ زیب تن کیے بربریت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔
رات کے اندھیرے میں اعجاز بیٹے کے ساتھ جہلم پار کرنے لگا۔ عبدالرزاق
کو پیٹھ پر لادے وہ مرے مرے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ دریا کے درمیان پہنچ
کر اعجاز پر غشی طاری ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے رزاق کی گردن کی گرفت اس کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ موجوں کی گود میں ہچکولے کھانے لگا۔
اندھیرے میں ہوش سنبھالے اعجاز بڑبڑانے لگا۔ "عبدالرزاق بیٹے!
رزاق کہاں ہو؟"

مگر جواب نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اب اعجاز کی حالت ایک پاگل سے کسی طور
کم نہ تھی ــــ کنارے پہ آکے وہ چلانے لگا۔

"آو! میں بھٹو کا قاتل ہوں۔ میں نے اسے پھانسی پر چڑھایا ہے ــــ
آو! کیا دیکھتے ہو؟ مجھے ختم کر دو ــــ موت کے گھاٹ اتار دو ــــ
انسان مردہ باد ــــ انسانیت مردہ باد ــــ کہاں ہے انسان ــــ
اشرف المخلوقات ــــ؟ بھٹو کو پاکستان میں پھانسی دی گئی اور یہاں ہمیں
عتاب و غضب کا ہدف بننا پڑا ــــ کیوں، ہمارا پاکستان سے کیا تعلق ــــ
اور ۱۹۴۷ء میں بھارت کے ساتھ ناطہ جوڑنے کا یہ صلہ مل رہا ہے۔
یقین کیجیے کہ اعجاز کی حالت اب بھی ابتر ہے، گو اس نے دماغی توازن کھو دیا
ہے، لیکن کبھی کبھار اس بدحالی میں بھی ایسی ایسی باتیں کیا کرتا ہے کہ ایک فلسفی سا
لگتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ دوسرے ملک میں رونما ہوئے حالات کے شکار ہم
کیوں بن گئے ــــ! لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بھٹو کو پھانسی پر لٹکانے سے
کشمیر کے طول و عرض میں پاکستان کے لیے نفرت و عداوت کا لاوا پھوٹ پڑا ہے!

رمضان۔ محکمہ راشن اسٹور میں بحیثیت چوتھے درجے کے اہلکار
کے کام کرتا ہے۔ یومیہ اُجرت ملتی ہے۔ ایک جھونپڑا نما مکان میں بیوی اصغری اور چار
سالہ لڑکے انور کے ساتھ زندگی کو نازندگی بنانے میں پیش پیش ہے۔ کوئی چھے سال
قبل اپنی لاغر اور بیمار ماں کے اصرار کرنے پر اصغری کو شریک حیات بنالیا تھا۔ شروع
شروع میں وہ اصغری کو دل و جان سے چاہنے لگا اور اس کی ہر فرمائش پوری کرنا اپنا
فرض سمجھتا تھا۔ لیکن ماں کے انتقال اور انور کی پیدائش کے بعد رمضان کی اُلفت اور
ہمدردی میں فرق آنے لگا۔ اب وہ گھر بھی دیر سے آتا اور اُجرت کا بڑا حصہ بھی عیاشی میں
صرف کرنے لگا۔ اصغری نے اسے سمجھایا بہت روئی بہت گڑگڑائی۔ مگر رمضان ٹس سے
مس نہ ہوا۔ اصغری نے گھر کا خرچ چلانے کے لیے مقامی دست کاری سنٹر میں داخلہ

لے لیا۔ وہ انور کو ساتھ لے کر سنیٹر میں پیپر ماشی کے ڈبے بنانے لگی جس سے کچھ رقم اسے مل جاتی۔ رمضان کا اب معمول بن گیا تھا۔ تھراپی لینا جوا کھیلنا اور گھر دیر سے آنا اور پھر اصغری پر سختی کرنا۔ اصغری نے ظلم اُٹھا کر بھی کوشش کی کہ رمضان اپنی ذمہ داریاں کو سمجھے اور وہ ایک خاوند اور سب سے بڑھ کر ایک باپ کے فرائض ادا کرے۔ اصغری کے بڑے بھائی رشید نے آکر رمضان کو بھلے بُرے کا احساس دلایا۔ دراصل وہ رمضان کا گہرا دوست بھی تھا۔ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے ہی رشید کے کہنے پر اس کے باپ نے اصغری کا ہاتھ رمضان کے ہاتھ میں دیا تھا۔ غرض اصغری نے ہر طرح کا ظلم سہہ لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی بچے کی خاطر اس نے ہر ستم گوارا کیا اور اُف تک نہ کی۔

ایک دن رمضان کو بچی بچائی رقم دی تاکہ وہ بازار سے انور کے لیے کپڑا خرید کر لاتے کیوں کہ انور کی چھٹی سالگرہ قریب تھی مگر رمضان گھر سے نکل کر سیدھا جوا خانہ پہونچ گیا اور جوئے میں اس نے وہ رقم بھی ہاری اور پھر حسب معمول اڈے پر جا کر دیسی شراب کی بوتل اُدھار خریدی اور حلق تر کرنے لگا۔ کافی رات گئے وہ گھر لوٹا ——!

"کیوں کہ آگئے انور کے لیے کپڑا" اصغری نے پوچھا۔

"کون سا کپڑا ... ارے ... ہاں ..... اصغری نیئے کپڑوں کے بغیر بھی تو سالگرہ منائی جاسکتی ہے ..... یہ۔ یہ سب تو امیروں کے چونچلے ہیں۔"

رمضان کی آواز بُری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اصغری غم کی تاب نہ لاسکی اور غصّہ میں اُبل پڑی۔

"کتنے ظالم ہو تم۔ بچے کی خوشی بھی تم کو گوارا نہ ہوئی۔ تم اس قدر گر چکے ہو۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کم از کم اس معصوم کی خوشنودی کی خاطر تو ہوش مندی سے کام لیا ہوتا۔ ... جانتی ہوں تم نے حسب عادت یہ پیسے کہاں صرف کیے ہوں گے؟ ۔ اُف! اصغری رو پڑی۔

غرض تو تو میں میں، نے اچھے خاصے جھگڑے کا روپ اختیار کر لیا اور پھر رمضان نے اپنے کیے پر پچھتانے کے بجائے حیوانیت کی راہ اپنائی اور اصغری کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور جب اصغری مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو کر گر پڑی تو رمضان نے روتے بلکتے ہوئے معصوم الور پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ اس معصوم کے واویلا کرنے پر اڑوس پڑوس کے لوگ آ کر جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ اصلیت سے باخبر ہونے کے لیے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے ساتھ بھی رمضان نے بداخلاقی کا رویہ اختیار کیا۔ سب اس کی نازیبا حرکت پر کافی برہم ہوتے۔ لیکن کر بھی کیا سکتے تھے؟

اصغری کو جب ہوش آیا تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اپنی غلطی پر پشیمان ہونے اور پچھتانے کی بجائے رمضان نے بے سبب اُس پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔ وہ رمضان سے بے حد بدگمان تھی۔

محلے والوں میں سے کسی خیر خواہ نے جا کے رشید کو اس کی بہن کی بد حالی کے بارے میں بتا دیا۔ رشید کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ پھر کیا تھا۔ رشید نے محلے کے چند بزرگوں سے تبادلہ خیالات کیا۔ تاکہ وہ اپنی بہن کو طلاق دلا سکے اسے اور الور کو رمضان جیسے حیوان سے چھٹکارا دلا سکے۔ اصغری نے مجبوراً اس سلسلے میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ الور کی سلامتی کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھی۔ محلہ کے بزرگوں اور خود مولوی وقار اللہ نے اگلے جمعہ کو نماز ظہر کے بعد اس معاملہ پر غور و خوض کرنے کا فیصلہ کیا۔

ادائیگی نماز کے بعد چند بزرگ، مولوی صاحب کی سرکردگی میں مسجد کے صحن میں جمع ہو گئے۔ رشید موجود تھا۔ رمضان اور اصغری کو بھی بلایا گیا۔

"کیوں رمضان یہ تمہارا معمول بن چکا ہے کہ ہر روز شراب پی کر گھر آؤ اور بیوی بچے پر ہاتھ اُٹھاؤ۔ آخر کس لیے۔ کیا یہی خدا اور رسولؐ کا فرمان ہے۔ کیا یہ تم شوہر ہونے کا حق اسی طرح ادا کرتے ہو؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ لوگوں کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس دُنیا میں کون نیک ہے کون بد۔ ذرا مجھ پر تہمت لگانے والے خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ وہ اصلیت میں کیا ہیں۔ گناہ سب کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں برائی کا اظہار کھل کر کرتا ہوں اور تم لوگ پردے کے پیچھے چوری چھپے یہ کام کرتے ہو۔" رمضان کے چہرے کا رنگ غصے کے مارے بدل چکا تھا۔ اس کی غیر متوقع باتیں سن کر مجلس میں انتقامی لہر منڈلانے لگی۔

"بدتمیز! بداخلاق، اپنی غلطی کو نہ مان کر تم ہم پر کیچڑ اُچھالنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ مولوی صاحب چلائے۔ اتنے میں حاجی ستار رمضان پر ہاتھ اُٹھانے کی غرض سے اپنی جگہ سے اُٹھے۔ دفعتاً اصغری برقعے میں ملبوس سامنے آکر معافی مانگنے لگی۔

تم اتنے ذلیل ہوئے کہ محلے برادری کا بھی لحاظ نہ رہا۔ خیر۔ ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ تم روزانہ افراتفری کا بازار گرم کرو۔ اور اصغری پر ظلم توڑو اور اپنے بیٹے انور پر ہر قسم کا ستم ڈھاو۔ تمہیں اپنے فرائض کا احساس نہیں۔ تم کو سنّت رسول ﷺ کا بھی احساس نہیں۔ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"حاجی صاحب میری بہن کو اس رائشش کے شکنجے سے چھٹکارا دلادیجیے" رشید بات کاٹتے ہوئے کہہ اُٹھا۔

"میں اپنی بہن اور اس کے بچے کو لے کر گاؤں چلا جاؤں گا۔ خدا کا دیا ہوا میرے پاس بہت ہے حاجی صاحب لیکن میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتا مجھے خواب میں بھی یہ اُمید نہ تھی کہ شادی کے بعد رمضان اس طرح بدل جائے گا۔"

غرض ہر ایرے غیرے کی زبان اصغری کی بھلائی میں اور رمضان کے خلاف کھل گئی چھوٹا بڑا سب اس پر برس پڑے اور اصغری بے حس و حرکت ایک کونے میں بیٹھی سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک گٹھڑی سی معلوم پڑتی تھی۔ اس کے سامنے ہی انور بیٹھا سہمی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جب باتوں کی بوچھاڑ ذرا تھمی

تو مولوی وقار اللہ نے سکوت کے عالم میں بولنا شروع کیا۔

"رمضان اب تک جو کچھ سننے میں آیا۔ اس کے مطابق اب کوئی اور راستہ ہی نہیں رہا ہے۔ کہ اصغری کو طلاق دیدو۔ شادی مار پیٹ اور دھما چوکڑی کا نام نہیں ہے۔ اس طرح بیوی پر وقت بے وقت ہاتھ اُٹھانے سے صاف ظاہر ہے کہ تمہیں بحیثیت شوہر کے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں رہا ہے۔ جب کیوں ہو تمہیں اس ضمن میں کچھ کہنا ہے اس سے قبل کہ برادری اپنا فیصلہ سنائے تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو کہہ ڈالو۔"

"مولوی صاحب میں کیا کہوں جب کہ آپ لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ اگر طلاق حاصل کر کے اصغری اور اس کے بھائی رشید کو خوشی حاصل ہو سکتی ہے اور محلے والوں کی دلی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ تو اس ضمن میں کچھ بولنا ہی فضول سمجھتا ہوں۔ البتہ کوئی بھی قدم اُٹھانے سے قبل میں اصغری کی رائے اس بابت جاننا چاہوں گا۔ کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ فیصلہ کرتے وقت اُسے الود کی بہبودی کو مدنظر رکھنا ہو گا ——"

یہ سنتے ہی سب کے سب چہرے صحن کے اس کونے کی جانب دیکھنے لگے جہاں اصغری زرد اور افسردہ چہرہ لیے دم سکت بیٹھی تھی!

"یہ کیا کہے گی مولوی صاحب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ رمضان سے طلاق حاصل کرنا ہے۔ یہی خواہش میری بہن کی بھی ہے۔ اس پر سوچنا اب فضول ہے۔ میں اپنی بہن کی زندگی برباد نہیں ہونے دونگا۔ رمضان برائیوں کا مجسمہ ہے۔"

"لیکن رشید اس معاملے میں اصغری بیگم کو از خود کچھ کہنا پڑے گا ورنہ ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ سچ ہے کہ رمضان بُری عادتوں میں گرفتار ہو چکا ہے اور اصغری اگر طلاق چاہتی ہے تو یہ کوئی غیر شرعی فعل نہیں سمجھا جائے گا۔" مولوی وقار اللہ نے کہا۔

اور ادھر اصغری سوچ میں ڈوب گئی۔ اُسے یاد آیا وہ سماں جب ڈولی

میں سوار ہونے سے پہلے باپو نے اس سے کہا تھا۔

"بیٹی اب تم اپنے گھر جا رہی ہو اُس گھر کو اب اپنا حقیقی گھر سمجھنا اور اپنے گھر کو خوشیوں و مسرت سے بھر دینا تمہارا فرض ہے اب اس گھر سے تمہاری لاش ہی اُٹھنی چاہیے بیٹی۔ کیوں کہ بیوی کا اصلی مقام اس کے شوہر کے قدموں میں ہی ہوتا ہے۔"

یہ سوچتے ہی اصغری اپنی جگہ سے اُٹھی الور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حاضرین سے مخاطب ہوئی۔

"رشید بھیّا خوب عزّت اُتاری ہے تم نے میری اور اپنے بہنوئی کی اس مجلس میں۔ میں مانتی ہوں کہ میرے شریک حیات زیادتی سے کام لے رہے ہیں لیکن تم یہ کیوں فراموش کر جاتے ہو کہ میں ان کی بیوی ہوں، ان کا ایک انگ ہوں، سُکھ دُکھ میں ان کا ساتھ میں نہ دوں گی تو اور کون دے گا۔ میرے گھر کی عزت کو اس طرح اُچھالنے کا کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ طلاق کی بات کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ روٹھے ہوئے دلوں کو جوڑنے میں کتنا ثواب ہے۔ مولوی صاحب شادی کوئی مذاق نہیں ہے کھیل نہیں ہے۔ جو اس طرح اس پاک رشتے کی رسوائی کی جائے اور جب جی چاہے جوڑ لیا جب دل چاہا توڑ دیا۔ اگر الور کے باپو نے سختی سے کام لیا۔ تو کیا میں فرض شناسی کا راستہ چھوڑ کر پاپ کا راستہ اپنا لوں؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ الور اپنے باپو سے کہدو کہ گھر چلیں۔ بڑے آئے یہ لوگ میری زندگی میں دخل دینے والے"۔

دیکھتے ہی دیکھتے ماحول پر خاموشی طاری ہوگئی۔ کسی میں بھی کچھ کہنے کی ہمت باقی نہیں تھی سب ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ جیسے سب کو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ سب کی زبان پر تالے پڑ گئے۔

دفعتاً اصغری ایک فاتح کی طرح مسجد کے صحن سے باہر نکلی اور الور اس کے ساتھ تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے مرے مرے قدموں کے ساتھ رمضان بھی چلنے لگا۔ اس کے ماتھے پر ملامت اور شرم ساری کے آثار صاف عیاں تھے۔ "اسے روشن ضمیری کہتے ہیں۔ مولوی صاحب" دور بیٹھے محلے کے بزرگ شفیق صاحب کہہ گئے اور مجلس برخاست ہوگئی۔

★★★

ٹوٹی کہاں کمند

لگاتار ہفتہ بھر بارش اور سرد ہواؤں کے بعد پچھلی ایتوار کو موسم کچھ سازگار صورت اختیار کر گیا۔ لوگ جن میں سیاحوں کی تعداد زیادہ تھی جوق در جوق جھیل ڈل و مغل باغات کی سیر کو نکل پڑے، دن کا کھانا کھانے میں بھی اپنے ساتھی قیوم کی شرکت میں گھر سے چل پڑا۔ نہرو پارک کے قریب گشتی ڈاک خانے کے مقابل جنرل روڈ پر لوگوں کی بھیڑ دیکھنے کو ملی۔ پوچھ تاچھ کرنے پر علمیت ہوئی کہ سنیل دت صاحب فلم راکی کے لیے ایک دلکش منظر اپنے بیٹے سنجے دت اور ٹینا منیم پر فلمارہے ہیں۔ گو ہماری عمر اب اُس منزل سے کوسوں دور چلی گئی ہے کہ ہم کسی فلم کی شوٹنگ دیکھنے میں وقت ضائع کریں لیکن پھر بھی نہ جانے کس جذبے کے تحت ہم بھی کچھ وقت کے لیے وہاں رک گئے اور قریباً آدھ گھنٹہ کچھ من چلے نوجوان اور لڑکیاں جن

میں ہیرو ہیروئن بھی شامل تھے نیم عریاں لباس میں ملبوس کو لہے سے کولہا ملائے مغربی طرز کی دھن پر ناچتے اور گانے میں محو تھے۔ اور حاضرین بظاہر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ویسے فلمیں درس و تدریس اور اخلاقی لوازمات کو بڑھاوا دینے میں اہم پارٹ ادا کر سکتی ہیں۔ آپسی یگانگت و رواداری کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں لیکن ہندوستانی فلم انڈسٹری گھٹیا اور تہذیب سے گری فلمیں تیار کرنے میں پیش پیش ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس اخلاق شکن اقدام کی بابت کوئی احتجاج کرنے والا بھی نہیں۔ دراصل دوسرے شعبوں کی طرح اس فلمی صنعت کی وسعتوں پر بھی شیطانی قوت نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔

اس مایوس کن واقعہ کو نظر انداز کیے ہم دونوں دوست شکارے میں نشاط باغ کی جانب چل پڑے۔ باغ کا ہر گوشہ قریب قریب لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ وہاں پر ایک ایسے واقعہ سے دوچار ہونا پڑا کہ تفریح کا مزہ کر کرا ہو کر رہ گیا۔ پُر فضا و پُر ہنگم ماحول میں یاسیت کے بادل اس کرخت انداز سے چھانے لگے کہ دونوں دوست مغموم و مضمحل حالت میں گھر کا رُخ کر گئے۔

ہاں تو ہوا یہ کہ نشاط باغ کے مدھ میں جہاں فواروں کے جھرمٹ میں ایک بالادری اپنے ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ اُس کے گوشہ راست میں چنار کی چھاؤں میں ایک نوجوان بظاہر اپنی محبوبہ کے ساتھ بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرنے میں محو تھا۔ انہیں گردو پیش کا ذرہ بھر احساس نہیں تھا۔ کبھی کبھی فرط محبت یا فرط ہوس میں وہ ہاتھ میں ہاتھ لیے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے میں سموتے کی سعی کرتے تھے۔ ویسے دونوں نے غضب کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ عاشق کا گریبان کھلا کھلا سینے کے بال اور گلے میں لٹکا ہوا تکونی لاکٹ صاف نظر آرہا تھا۔ جس میں جڑے چمکدار شیشے میں سے شعاعیں بکھر جایا کرتی تھیں۔ بال تو اس قدر بڑھائے تھے کہ ماتھا۔ کان! اور گردن باوجود کوشش کے نظر نہ پڑتے تھے محترمہ نے تو باریک طرز کے پولسٹر کا فراق برائے نام زیب تن کیا تھا۔ سینے کا

اُبھار صاف اور واضح طور نمایاں تھا بال شانے پر بکھرے ہوئے ۔ ماتھے پر کاکل کا ہالہ، گویا ہر طرح سے دعوت نظارہ دے رہی تھی ۔

محترمہ کا جائزہ لیے قیوم کے منہ سے بے ساختہ یہ شعر نکلا :-

رقصاں ہیں تیرے لب پہ جوانی کی بہاریں
غلطاں ہیں تیری آنکھ میں ساون کا مہینہ

خیر فی الحال عاشق صاحب ماتھے پر گرے کاکل کو پھونک مار کر یا انگلیاں مس کر کے فرحت محسوس کر رہے تھے ۔ لڑکی نے ہونٹوں اور گالوں کے ساتھ ساتھ ابرو کو نہ جانے کس چیز سے نوازا تھا کہ صورت میں بلا کی سی کشش سما گئی تھی ۔ اس جوڑے سے کچھ پاس ہی ناشپاتی کے درخت سے ٹیک لگائے اعلیٰ طرز کا سوٹ پہنے ایک نوجوان انہیں ٹک ٹک دیکھنے میں محو تھے اس کی آنکھوں پر گہرے رنگ کی عینک چڑھی تھی ۔

اس منظر سے قطع نظر قیوم شکم پروری کی غرض سے باغ کے بازو میں واقع چائے خانہ کی جانب چل پڑے ۔ چائے نوش کیے اور پنیر پکوڑا کی کچھ قاشیں حلق پر اُتارنے کے بعد ہم باغ کا چکر کاٹ کے غیر ارادی طور اسی گوشے کی جانب چل پڑے جہاں متذکرہ جوڑا بیٹھا ہوا تھا ۔ خلاف توقع دونوں اب بھی باتیں کرنے میں محو تھے ۔ اور غضب یہ کہ پاس پڑے لکڑی کے بینے بنچ پر تسلط جمانے ہی والے تھے کہ محبوبہ کی زبان کام کر گئی ۔

" اسلم دیکھو تا یہ کس قدر کمینہ ہے برابر گھنٹوں سے اپنی جگہ جم کے رہ گیا ہے ۔ اور برابر ہمیں جھانک رہا ہے ۔ بد معاش کے دیدے پھوٹیں ! "

" جانے دو نیلم ! چلو ہم ہی جگہ تبدیل کریں ۔ ویسے تمہارے ساتھ کوئی دیرینہ جان پہچان تو نہیں ؟ " اسلم نے معاملہ رفع دفع کرنے کی نیت سے کہا ۔ "

" جان پہچان ! میں نے اس بے ہودہ شخص کو پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں

ہے میں اس اُلو کے پٹھے کو مزہ چکھاؤں گی۔ اس کی یہ مجال کہ برابر ہمیں گھور رہا ہے"۔
یہ کہہ کے محبوبہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور زمین پر پڑا ڈوپٹہ شانوں پر ڈالے اس نوجوان کی جانب شان بے نیازی کے ساتھ چل پڑی۔

"بدمعاش کہیں کے! تمہاری کوئی ماں بہن نہیں ہے۔ کیا پتھر سے پھوٹ پڑے ہو جو کنکھیوں سے دُزدیدہ نظروں سے ہمیں جھانک رہے ہو۔"

"ڈارلنگ چھوڑ دو۔ معاملے کو طول دینے سے کیا فائدہ اس میں ذرا بھر شرافت ہو تو آئندہ اس طرح کے حربے اپنانے سے باز آئے گا۔ تمہی نے سارا موڈ آف کر دیا۔"

اسلم نے پھر سے نیلم کو سمجھایا۔ لیکن اس پر انتقامی بھوت بڑی طرح سوار ہوا تھا۔ ایک نہ مانی۔

اتنے میں طرح طرح کے لوگ جن میں سیاحوں کی تعداد زیادہ تھی چنار کے درخت کے آس پاس جمع ہو گئے اور سب کی نظروں کا نشانہ وہ نوجوان بنا ہوا تھا جو اب بھی ناشپاتی کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ اس کے ہونٹ کپکپا سے رہے تھے۔

"ایسے بے غیرت و بدفطرت اشخاص ہی ریاست کی عزت مٹی میں ملانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے"۔
یہ ایک نیم معمر شخص کا مشورہ تھا۔

"دیکھیے آپ سب اصلیت سے ناواقف ہیں۔ مجھ پر کسی طرح کا الزام لگانے سے قبل آپ حقیقت حال سے باخبر ہونے کی کوشش کریں۔"

نوجوان نے اپنی صفائی میں زبان کیا کھول دی کہ محبوبہ کی آنکھوں میں غصے کے مارے خون اُتر آیا۔

"ارے کمینے اتنی مدّت سے تانک جھانک سے کام لے رہا ہے ا
اور اُوپر سے جھوٹ بول رہا ہے۔"

اتنے میں اس مختصر ہجوم میں سے نہ جانے کس من چلے نے غالباً محترمہ کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے دایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا اور ایک زوردار تھپڑ اس نوجوان کے گال پر ثبت کر دیا۔

یک لخت عینک آنکھوں سے اُتر کر زمین بوس ہو گئ۔

اُف میرے اللہ! یہ میں نے کیا کر دیا۔ آئی ایم ساری"

من چلا جوان چلایا۔

"مجھے معاف کر دیجیے۔"

محترمہ بڑبڑائی۔

ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ ایک ایک کر کے سب لوگ منہ لٹکائے آگے بڑھتے گئے کچھ ایک دوسرے کو شرمندگی و ندامت سے لبریز نگاہوں سے دیکھنے لگے اور عاشق مزاج جوڑا اذیت کے تجربے گراں میں غرق مرے مرے قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے لگا۔ شرمندگی کے آثار اُن کے چہروں سے عیاں تھے۔

دفعتاً قیوم اور مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہوا۔ عینک اُٹھا نے اس جوان کی آنکھوں پر چسپاں کرنے کے بعد ہم بھی آگے بڑھ گئے! ہاں تو اس اصلیت کا انکشاف کرتا چلوں کہ متذکرہ نوجوان اندھا تھا۔

گزرے لمحات کا کرب

یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ میں MBBS فائنل سال میں زیرِ تعلیم تھا۔ اب تو فالتو وقت دوست احباب کی صحبت میں نہیں بلکہ نجی اسٹیڈی روم میں گزارا کرتا تھا۔ والد صاحب شہر کے مشہور سرجن مانے جاتے تھے۔ اسٹیڈی کمرہ میں سائنس سے متعلق بہت سی اشیاء، کتابیں تھیں اور سامنے دیوار پر میرے گمشدہ دوست انور کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ انور میرا جگری دوست تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے والدین انور سے نفرت کرتے تھے۔ انور بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے البتہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اُس کی یہی غربت غالباً میرے والدین کو کھٹکتی تھی۔ ان کے دشمنانہ رویہ کے باعث انور ایک رات چپکے سے غائب ہو گئے۔ وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا ــــــ خیر فائنل امتحان کی تیاریوں میں

مجھے ایک تازہ انسانی ڈھانچے کی ضرورت پڑ گئی ۔ اور والد صاحب کی وساطت سے مطلوبہ ڈھانچہ آسانی کے ساتھ دستیاب ہوا ــــ ایک شام جب کہ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ تین روز سے گھٹائیں مسلسل بارش برسانے لگیں ۔ جس کی وجہ سے سردی میں اضافہ ہو گیا تھا ۔ میں نے اسٹیڈی روم کا دروازہ اور تمام کھڑکیاں بند کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور پھر غیر ارادی طور میری نگاہیں اس تازہ ڈھانچے پر جم گئیں ۔ سگریٹ سلگا کر میں دھواں اُڑانے لگا ۔

نہ جانے کیوں اس ڈھانچہ سے مجھے اُنس سا ہو گیا تھا کہ یا وجود کوشش کے نظر ہی نہیں ہٹتی ! اتنے میں مجھے زور کی سردی لگی ۔ میں نے پاس والے کمرے سے کمبل لا کے کاندھوں پر ڈال دی ۔ حالت میں سراسیمگی سی چھانے لگی ۔ لحظہ بہ لحظہ میرا سر بھاری ہونے لگا اور مجھ پر غشی سے طاری ہونے لگی ۔

اس تذبذب کے عالم میں اسٹیڈی روم کا دروازہ کھلا اور میں نے الور کو انداز دِگر میں اپنے روبرو پایا ۔

یکایک کہاں غائب ہو گئے تھے ۔

میں نے تجسسانہ لہجہ میں کہا ۔ اتنے میں نو وارد کے لب ہل گئے ۔

" یہ سب نہ پوچھو دوست ! البتہ یہ بتاؤ کہ میری تصویر کے ساتھ میری محبوبہ کی تصویر کیوں آویزاں نہیں ہے ؟"

میں نے الور کا بغور جائزہ لیا ۔ ایک عجیب سی صورت بنائی تھی ۔ بال بکھرائے کپڑے گیلے اور آنکھوں میں بلا کی کشش ـــــــ مجھے ڈر سا لگا اور پھر مزید جاننے کی ٹوہ میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی ۔

" تصویر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری محبوبہ کون ہے کہاں ہے ۔ تم اتنی مدّت کہاں رہے اور تم نے کس لڑکی سے کب اور کہاں محبت کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ تفصیل سے بتا دو الور ؟"

یہ کہہ کے میں الور کی جانب بڑھنے لگا ۔ مگر وہ پیچھے کھسک گئے ۔

"احمد میرے نزدیک آنے کی کوشش مت کرو ... میں سب کچھ بتادوں گا۔ تمہارے والدین کا کرخت لہجہ بھانپے میں نامعلوم منزل کی جانب چل پڑا۔ کچھ روز بعد میں نے ڈوڈہ میں فروکش ہوا۔ وہیں میں نے محبت کی اور وہیں سے میری ہڈیوں کا یہ ڈھانچا تمہارے پاس آیا ہے۔"

یہ سب کہتے انور نے سامنے رکھے ڈھانچے کی طرف اشارہ کیا میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اتنے میں اس کی آنکھیں لال ہوگئیں۔ جیسے اُن میں خون اُتر آیا ہو۔ وہ بجلی کی طرح چمکا اور بادل کی طرح کڑکتا ہوا بولا۔

" احمد تم لوگ اس دنیا میں کچھ بن جانے کی چاہ میں غریب اور لاوارث جسموں کے ڈھانچوں کی مدد لیتے ہو۔ ڈاکٹر کا عہدہ اختیار کرتے ہو۔ پیسہ کماتے ہو اور زندگی آرام سے کاٹ کے چین سے اس جگہ کو خیرباد کہتے ہو۔ تم لوگوں کا مردہ جسم نذرآتش یا دفن کیا جاتا ہے۔ اس لیے ڈھانچوں کی شکل میں سائنس روم کی زینت بننے کی نوبت نہیں آتی۔ بلکہ مٹی سے نکل کر پھر سے مٹی میں مل جاتے ہو! لیکن لاوارث و نادار ڈھانچے ... اس میرے ڈھانچے کی طرح بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس دنیا کے دستور کے بموجب انہیں سکون نہیں ملتا اور نہ منزل۔ احمد یہ ڈھانچا میرا ہے۔ نادار مردہ ڈھانچا۔ کیا تم جیسے دولت کے بادشاہ اپنی رعایا کو مرنے کے بعد بھی معاف نہیں کرتے!"

میری حالت غیر تھی۔ اتنے میں انور کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور پھر میرے اصرار کرنے پر انور سامنے اسٹول پر بیٹھ گیا اور آپ بیتی سنانی شروع کردی۔

" مجھے مفلسی ورثے میں ملی تھی۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو احمد اور اس روز جب کہ میرا معمولی گھر بھی دوسری عمارتوں کے ساتھ آگ

کی زد میں آگیا اور میرا واحد سہارا ماں یہ صدمہ برداشت
نہ کر سکی ۔ اس کی بے وقت کی دائمی جدائی نے مجھے بے بس
کر دیا ۔ اب اس لمبی چوڑی دنیا میں میرا کوئی نہ تھا جس کے لیے
زندہ رہنے یا زندگی بنانے کی بابت اقدام اٹھاتا ۔ آوارہ بادل
کے ٹکڑے کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا ۔ اس دوران نہ جانے
کس مصلحت کے تحت تم نے دوستی و اپنائیت کا ہاتھ میری جانب
دراز کر کے مجھے پناہ دی تھی ۔ اپنا حقیقی دوست بننے کا شرف
بخشا ۔ لیکن اس کردگار کو یہ سب کچھ منظور نہ تھا ۔ نہ جانے
کس وجہ کے باعث میری ادنیٰ ذات تمہارے والدین کی
آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی ـــــــ اُن کا خیال
تھا کہ اُس سال بی، اے کے فائنل امتحان میں تم میری وجہ سے
ناکام ہو گئے تھے ۔ مجھے بے عزت کیا گیا ۔ میری غیرت کو یہ سب
کچھ ناگوار گزرا ۔ میں تم سے اجازت لیے بغیر اس رات فرار
ہوا اور بھدرواہ جانے والی بس میں بیٹھ گیا ۔ اس خیال
سے کہ بچپن کے ساتھی اشتیاق کی صحبت میں کچھ ایام گزار
دوں گا ۔ جو وہاں پٹواری کی حیثیت سے کام کرتے تھے ۔
گاڑی روانہ ہو گی اور میں تفکرات کے پیچیدہ گتھیوں میں
اُلجھ کر رہ گیا ۔ مختلف طرح کے خیالات دل و دماغ میں
اُبھرنے لگے ۔ بازو والی سیٹ پر ایک نوجوان براجمان تھا ۔
گاڑی چلنے کے ساتھ ہی اس کے ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع
ہوا ۔ وہ ڈوڈہ کے رہنے والے تھے ۔ اور پھر اُن کے ذریعے
مجھے علم ہوا کہ اشتیاق تبادلے پہ پونچھ چلا گیا ہے ۔ بٹوٹ
میں دن کا کھانا کھانے کے بعد میں نے رقم ادا کرنا چاہی تو مجد

نے روک دیا۔ اور پھر ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہونے لگے۔ میری داستان غم سن کر امجد کو افسوس ہوا اور پھر انہوں نے مجھے ڈوڈہ میں قیام کرنے پر مجبور کر دیا۔

ڈوڈہ پُل پر اُتر کر ہمیں ٹیکسی میں ڈوڈہ شہر جانا پڑا ایک پہاڑی علاقہ۔ امجد کی ماں اور چھوٹی بہن نے مجھے بھی بھرپور پیار دیا۔ اور پھر چھٹیاں گزار کے امجد کو واپس سرینگر جانا ہوا۔ وہ پرائیویٹ ادارہ میں کام کرتے تھے۔ مجھے بھی اس ادارے میں کام فراہم ہو سکتا تھا۔ لیکن میں سرینگر نہیں آنا چاہتا تھا۔

امجد کی ماں نے مجھے بیٹے کی طرح چاہا۔ لیکن میں اُن پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں نے روٹی کمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیابی نہیں ملی۔ اور پھر ایک روز امجد کے ماموں گھر آ گئے اور مجھے اس اُس طرح کی سنا کر دل برداشتہ کر دیا۔ میں کسی ایک کو کہے بغیر ایک روز بستی سے چل پڑا۔ پاس ہی ایک نالہ بہتا تھا ——— مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس دھرتی پر وجود کو بوجھ تصوّر کرنے لگا۔ دل و دماغ میں سراسیمگی چھانے لگی اور اس افراتفری کے عالم میں اپنے وجود کو مٹانے کی ٹھان لی۔ میں نے پہاڑی سے اپنے کو گرانا چاہا۔ کہ دفعتاً کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا کیوں کرتے ہو؟"

"مرنے کے لیے"

"کیوں مرنا چاہتے ہو؟"

"پریشانیوں سے ابدی نجات حاصل کرنے کے لیے"

میں نے اتنا کہا تو وہ مسکرا کر تسلّی بخش لہجہ میں بولی۔

"خودکشی کرنا بزدلی ہے۔ تم میرے ساتھ چلو پاس میں گھاٹ گاؤں میں میرا گھر ہے۔ تمہیں اپنی زندگی ختم کرنے کا حق نہیں ہے۔"

"خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ میں اتنا بدنصیب و بدقسمت ہوں کہ جس کسی درخت کے نیچے فروکش ہوا وہی ہوائے دگر سے خاکستر ہو گیا۔"

"نہیں میں تمہیں یہ گناہ نہیں کرنے دوں گی۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ گاؤں کے وسط میں اس کا بنگلہ تھا۔ دالان میں قدم رکھتے ہی میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کسی متمول گھرانے کی چشم و چراغ ہے۔ سب سے پہلے اس محترمہ نے مجھے گرم سوٹ، ایک چپل اور ٹوپی لا کر دی۔۔ ۔۔۔ ہاتھ منہ دھوئے میں نے ان کے اصرار پر کپڑے پہن لیے۔

"بہت اچھے لگتے ہو۔ اس لباس میں" اس نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"کیا یہ کپڑے آپ کے شوہر کے ہیں؟"

"کیسی بات کرتے ہو۔" وہ قدرے لجا کر کہنے لگی۔

"ابھی تو میں کنواری ہوں۔ تمہیں تعجب تو ضرور ہوگا کہ میرے والدین نوکری کے سلسلے میں جموں میں قیام پذیر ہیں۔۔۔ کبھی کبھار میری خیریت جاننے کے لیے آجاتے ہیں۔ یا میں اُن سے مل آتی ہوں۔"

"تو یہ مردانہ کپڑے کس کے ہیں؟"

"میرا بڑا بھائی یہیں رہتا ہے اس کے ہیں۔" وہ میری گھبراہٹ بھانپ کر بولی۔ کچھ وقت گزرنے پر طلعت کے بھائی ضمیر تشریف لائے تو طلعت نے سب باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔

ویسے ضمیر خوش مزاج نظر آیا اور ملنسار بھی۔

آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کی محبت میں اور نزدیک آگئے! اپنائیت

کے سوتے پھوٹنے لگے۔ طلعت اور میں دونوں غیرارادی طور ایک دوسرے میں دل چسپی لینے لگے۔

وقت گزرتا گیا۔

طلعت کے بھائی ضمیر بھی میرے گہرے دوست بن گئے۔

ایک روز ضمیر پاس کے گاؤں، مولوی اسحاق کے لڑکے کی شادی میں شرکت کرنے چلے گئے۔ اس شام بادل گرجے، بارش پڑی اور ضمیر دیر تک واپس نہ آئے رات کو زبردست آندھی چلی اور اس مکان میں ہم دو اکیلے۔ غالباً رات کے بارہ بجے تھے کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں نے تذبذب میں دروازے کی چٹخنی گرادی۔ سامنے شب باشی کے مہین کپڑوں میں ملبوس طلعت تھی۔ بغیر کچھ کہے وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

"تمہیں بھی نیند نہیں آتی" وہ میرے پلنگ کے قریب پڑی بنچ نما کرسی پر بیٹھ کے کہہ گئی۔

"خدا معلوم کیا ہوا ہے آج میری نیند کو اور پھر سماں بھی ڈراونا ہے"، میری زبان کام کر گئی۔

"آج میں تم سے الور ایک بات کہنا چاہتی ہوں" وہ یوں کہہ رہی تھی گویا اس کی باتوں میں کچھ بوتلوں کا نشہ سمٹ آیا ہو! اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور سینہ کانپ رہا تھا۔

"بولو الور بُرا تو نہ مانو گے؟"

"برا کیوں مانوں گا" اور آہستہ آہستہ میرے دل میں خوف پیدا ہو گیا۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں" یہ کہہ کر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

"میرا جواب بھی یہی ہے" یہ کہہ کر میری زبان جیسے بند ہو گئی۔ وہ میرے سینے سے چسپاں ہونے کے لیے آگے بڑھی۔

اسی دوران کمرے کا دروازہ کھلا۔ ہماری نگاہیں دروازے کی جانب گئیں۔
ہمارے جسم کا سارا خون پل بھر میں خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جلدی سے عاجزانہ
نگاہوں سے اپنے بھائی کو دیکھتی ہوئی اس کی جانب بڑھی۔

"طلعت"، ضمیر اپنے جسم سے برساتی اُتار کے طنز سے بولا۔

"کیا یہی تمہارا لاوارث شریف مہمان اور میرا دوست ہے۔
جس کو از راہ انسانیت تم نے گھر میں رکھنے کی سفارش کی تھی"۔
وہ اپنے بھائی کے پہلو میں مجرم کی طرح کھڑی تھی۔

"ہم تمہارے مہمان کو اسی وقت اس مکان سے چلے جانے
کا حکم دیتے ہیں۔ ورنہ اس آستین کے سانپ کو میں زندہ
نہیں چھوڑ دوں گا۔"

یکایک ضمیر کا موڈ بگڑ گیا۔ دالان سے نکلنے پر میں نے طلعت کی طرف دیکھا۔

"میں مجبور ہوں انور! میرا انتظار کرنا۔ میں تمہاری ہوں،
فقط تمہاری"۔ طلعت آنکھوں آنکھوں میں یہ سب کچھ
کہہ گئی۔

میں انہی الفاظ کے سہارے بستی سے باہر آیا۔ بجلی چمک کے میری راہبری
کر رہی تھی۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اس طرح بے کسی کے عالم میں نامعلوم منزل کی جانب چلتے چلتے میرے
پاؤں کو ٹھوکر لگی۔ اور میں گہرے نالے میں سر کے بل گر پڑا۔ نیچے نوکیلا پتھر تھا جس
سے میرا سر زور سے ٹکرایا۔ میری سانس اس نالے میں اکھڑی اور دیکھتے ہی
دیکھتے روح بدن سے سدا کے لیے پرواز کر گئی۔

انور اتنا کہنے کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہاتھوں کو ملتا ہوا عاجزی
سے بولا۔

"طلعت اب اس دنیا میں نہیں ہے وہ بھی میری موت کے بعد تڑپ تڑپ کر

جان دے گئی۔ البتہ اس کے مردہ جسم کو اُس کے گھر والوں نے دفن کر دیا۔ اس لیے وہ قدرے پُر سکون ہے۔ لیکن میری قسمت میں دفن ہونا نہیں تھا۔ بلکہ سرکاری ہسپتال میں میرے کار آمد اعضاء نکالے میرے ڈھانچے کو بابت نمائش رکھا گیا۔

یہ سب کہہ کے الور نے مجھے طلعت کا پتہ بتایا اور رخصت ہوتا ہوا آخری بار التجا کی۔

"ہو سکے تو میری قبر طلعت کی قبر کے پاس بنوا دینا۔ میں اس آخری احسان کے لیے تمہیں سدا دعائیں دوں گا الور۔"

کسی نے جیسے کمرے کا دروازہ بند کر لیا ہو۔ میں نے ہوش سنبھالے گھبرا کر ادھر اُدھر جھانکا۔ بارش اب بھی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ ہڈیوں کا تازہ ڈھانچہ سامنے خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ڈھانچے سے آنکھیں ہٹائے الور کی تصویر کو سینے سے لگائے میں بچوں کی طرح رونے لگا۔ اور پھر اولین فرصت میں ڈھونڈھ جا کر میں طلعت کے بھائی ضمیر سے ملنے میں کامیاب اُترا۔ الور اور طلعت کی دائمی جدائی نے اُن کی حالت دگرگوں بنائی تھی۔ ضمیر کو اپنے کیے پر نہایت افسوس تھا۔ اُس نے فقط الور کی محبت کا امتحان لینا چاہا تھا۔ وہ اپنے کیے پر نادم تھا۔

میں نے ڈھانچے کی بابت ضمیر کو اصلیت بتا دی جو میں نے لکڑی کے بکسے میں اپنے ساتھ ڈھونڈھ لیا تھا اور پھر ضمیر کی شرکت میں الور کے ڈھانچے کو اس کی خواہش کے مطابق طلعت کی قبر کے پہلو میں مذہبی رسومات کے تحت دفن کیا گیا۔ واپس آنے پر طلعت کی تصویر میں نے ضمیر سے حاصل کر لی اور الور کی تصویر کے ساتھ دیوار کی زینت بنا گیا۔

گو اس واقعے کو برسوں گزر گئے لیکن پھر بھی کبھی کبھی یہ دلخراش واقعہ یاد آ کے مجھے تڑپا دیتا ہے۔
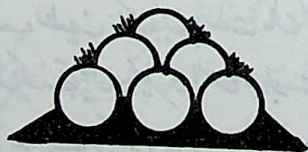
اندھا کنواں

جبل پور کے اُمتی علاقے کا بڑا چوک چار کھلی سڑکوں کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی گلی کا بھی موجد ہے جو پولیس چوکی سے ہو کے نئے محلے کی طرف جاتی ہے۔

عموماً پلاٹ پر آنے جانے کے لیے یہ گلی ایک پل کا کام دیتی ہے۔ دراصل اس گلی کے وسط میں ایک پرنالہ بھی ہے جس میں سے لگاتار گندے و غلیظ پانی کا نکاس ہوتا رہتا ہے۔ اس کی دم توڑ بدبو اڑوس پڑوس میں پھیل جاتی ہے۔ اور صاحب لطیف ناک میں دست مال ٹھونسے کثیف فضا سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی اس بدبو سے لپٹ لپٹ کر پیار کرنے والے میں نے بہت سارے دیکھے جو پاس میں باون پتوں کی اٹھک بیٹھک میں

مشغول رہتے ہیں۔ غنڈہ گردی کی وارداتیں دھراتے ہیں۔ دال چند کی پارٹی اپنا سکہ منوانے کے سودے کرتی ہے اور تو اور اس نالے کے آس پاس تعمیر شدہ جھونپڑوں میں وہ لوگ زندگی گزارنے کے لیے مشغول ہیں جنہیں اس جہانِ آب وگل میں زندگی گزارنے کے لیے عمدہ ذرائع حاصل نہیں۔ مجبوری کا دامن تھامے یہ غریب لوگ اپنے ادھ ننگے جسموں کو دنیا والوں کی نظروں سے چھپانے کی خاطر ان جھگی جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔

یہ جھونپڑے ان کے اپنے نہیں ہیں بلکہ ایک ٹمبر ٹھیکیدار یوسف تارا کی ملکیت میں شامل ہیں۔ جو ان مفلسوں و لاچاروں سے جائز کرایہ ماہ بہ ماہ وصول کرتے ہیں۔ یوسف تارا جہاں اتنی بڑی ملکیت کے مالک ہیں ساتھ ہی بڑے پیمانے پران کا کاروبار چل رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ دینی، دنیاوی ہر دو طرح کے فضائل و دولت سے مالا مال ہیں۔ نماز پنجگانہ ادا کرنے کے پابند ہیں۔ گھمنڈ اور تکبر نے یوسف تارا کو اپنا ہدف نہیں بنایا اور وہ حقیقی معنوں میں انسانیت، محبت اور رواداری کے دلدادہ ہیں۔

ان کی شرافت کی حد یہ ہے کہ اکثر کرایہ دار ادا کرنے سے بھی رہ جاتے ہیں۔ تیس۳۰ چالیس۴۰ جھونپڑیوں میں مقیم طرح طرح کے لوگوں کا ایک خاندان بن چکا ہے۔ اور یوسف تارا کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خاندان اس نے خود بسایا ہے۔ اس پھیلے ہوئے خاندان کا خیال وہ ہر طرح سے رکھتے ہیں۔ ابھی برسات کے موسم نے بال و پر نہ پھیلائے کہ یوسف تارا صاحب ترکھان (بڑھئی) سے کہہ گئے کہ جھونپڑیوں کے چھپروں چھتوں کو ٹھیک کر دینا۔ تاکہ برسات میں کسی ایک کو تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

غرض کہ جو صفات و فضائل ایک نیک سیرت انسان میں ہوتے لازمی ہیں وہ یوسف تارا میں موجزن ہیں ——— یوسف تارا کے اکثر

عزیز و اقارب ہنگامہ کے دنوں میں گو ہجرت کیے پاکستان چلے گئے تھے۔ لیکن یوسف تارا کو ہندوستان سے محبت تھی۔ اپنی جنم بھومی سے الفت و انسیت تھی اور وہ اسے تیاگ دینے سے رہ گئے۔

یوسف تارا کا کہنا تھا کہ اس سرزمین کو کیسے چھوڑ دوں جس کے ذرے ذرے پر اس کے سجدوں کے نشان منقش ہیں جس کی گود میں ان کا بچپن بیتا ہو۔ لڑکپن ڈھل چکا ہو۔ جوانی رنگ جما گئی ہو ـــــ اور زندگی کا ہر روشن و تاریک پہلو اجاگر ہو کے رہ گیا ہو۔ وہ اس شہر سے الگ کیسے ہوں اور پھر اس سرزمین میں اس کے آبا و اجداد کے جسم مدفون اور روائتیں موجود ہیں! اتنا گہرا رشتہ ہونے کے سبب یوسف آج تک اس سرزمین ہند سے وابستہ رہے۔

آپ لوگ بھی سوچتے ہوں گے کہ کیا فضول سی داستان شروع کر دی ہے کہ جس میں نفسیاتی جنبش نہیں ـــــ جذباتی حرکت نہیں اور نہ ہی جمالیاتی پہلو ـــــ لیکن میرے قارئین کرام میں جس کہانی کو ہویدا کرنے کا ارادہ باندھ گیا ہوں اس کو رقم طراز کرنے سے قبل یوسف تارا جیسے نامی گرامی شخصیت سے واقف ہونا ضروری تھا۔

ان جھونپڑیوں کی زینت جہاں دال چند، رامو کمہار، حلیمن، معصوم چچا، اور پرکاش وغیرہ ہیں۔ وہاں ایک دوشیزہ بھی ہے جس کا نام امینہ ہے۔ اور لوگ اسے پیار سے یا ہتک سے آمیہ کہتے ہیں ـــــ

امینہ ایک مقامی گرلز اسکول میں ٹیچر ہے اس کے بہت بہت چرچے ہیں۔ اچھا نام کمایا ہے اور ہر گھر میں امینہ سے وابستہ کسی نہ کسی قصے اور لگی لپٹی کا آئے دن تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ چاہے وہ بیگم سراج کا بنگلہ ہو، ڈی او صاحب کا گھر ہو، جسٹس صدیق صاحب کی کوٹھی ہو۔ یا گسائیں سندھی کا گھروندا ہو ـــــ عزیز فرنیچر والے یا ماسٹر للن کی دکان ہو۔

غرضیکہ ہر جگہ اس دوشیزہ کے چرچے ہیں اور تو اور یوسف کو سب سے

زیادہ تشویش امینہ کی ہی تھی ۔ پہلے تو انہوں نے لوگوں کی باتوں پر دھیان نہ دیا۔
لیکن جب سننے میں آیا کہ ان کی بیوہ بیٹی کبیرہ کے پاکستان سے آتے پر امینہ کا
ان کے دولت کدہ پر آنا جانا بڑھ گیا ہے ۔

وہ پریشان ہوئے، لحظہ بہ لحظہ بیوہ بیٹی کے رنڈاپے پر امینہ کی آزاد
طبعی کا لبادہ چڑھنے لگا تو یوسف تارا کی آنکھیں کھل گئیں ۔

پہلے تو انہوں نے امینہ کو اپنے بسائے گئے خاندان سے الگ کر دینا چاہا
لیکن امینہ جیسے بڑے بڑے وکیلوں اور آفیسروں کا ساتھ حاصل تھا نہ نکل سکی اور
یوسف تارا نے اپنی عزت و ناموس کی چادر کو داغدار نہ ہونے کی خاطر اپنی بیٹی کو
پھر سے پاکستان بھیج دیا تاکہ اس کے پاؤں لڑکھڑا نہ جائیں ۔

میں نے امینہ کی بابت اِس اُس طرح کا بہت جگہ سنا اور تو اور اپنی
بیگم تو اتنا تک کہہ گئیں کہ جو اس ہکنی کے جنگل میں پھنس گیا برباد ہو کے رہا۔ اس کے
حسن اور آزاد طبعی کی بابت باتیں سُن کے میں نے خیال ہی خیال میں گھر بیٹھے ہی
امینہ کی شبیہہ بنانی شروع کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک اچھی لڑکی ہو گی، حسین و جمیل
سڈول جسم، سرو قد، غزالہ آنکھیں، صراحی دار گردن والی ۔

غرض میں نے اس پُر کشش لڑکی کی تصویر اپنے دل اور تصور میں بنا ڈالی
جسے ایک نظر دیکھ کر ایک وکیل بہک سکتا تھا۔ ایک آفیسر نرم پڑ سکتا تھا اور
ایک حاکم مہربان ہو سکتا تھا ۔

اس سے پہلے کہ میری قیاسی عمارت ٹھوس طور پر کھڑی ہو جاتی بھائی
نام کی وساطت امینہ کو سرسری طور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دیکھنے پر معلوم پڑا کہ نہ
اس کے گالوں پر کشمیری سیبوں کی رنگت ہے۔ نہ اس کے کھلے و بے ترتیب بالوں
میں کالی رات کی چمک پنہاں ہے ۔ اس کی آنکھوں میں جھیل کی گہرائی ہے نہ گردن
کی ساخت پر صراحی کا گمان ہوتا ہے ۔ حضرت علامہ اقبال رح کیا خوب فرما گئے ہیں۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اس کا رنگ مجموعی طور زیادہ پکے ہوئے ناشپاتی کی طرح خفیف زرد اور مُرجھایا مرجھایا سا تھا جس کو درخت پر دیکھے جی للچا جاتا ہے اور سامنے ہاتھوں میں لیے گھن سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی چال اور چلنے کے ڈھنگ میں یقیناً وہ اُٹھان تھی جو ایک گنوار لڑکی کو لکھنؤ کے شہید چوک والی زہرہ بائی کے ہاں رہنے و طبلے کی تھاپ پر ناچنے سے حاصل ہو سکتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس بے ڈھنگ مجسمے کو دیکھے حیرانی کے بحر بے کراں میں غرق سوچنے لگا کہ آخر امینہ میں کون سی خصوصیت پنہاں ہے ۔ جس کے سبب اس نے اچھا نام کمایا ہے اور اہل حبل پور کے اکثر نوجوان اس کے نام کی مالا جپنے میں مصروف ہیں ؟

لیکن

امینہ میں ایک بات تھی جو کسی ایک لڑکی کو مشکل سے حاصل ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تن تنہا رہتی تھی ۔ اور سالہا سال اس نے اکیلے پن میں گزارے تھے۔ بغیر کسی سہارے کے ـــــ یہی وجہ تھی کہ اس کی رفاقت وقت بے وقت حاصل کرتے میں وکیل صاحب ڈاکٹر صاحب، یا اور کسی شریف آدمی کو کسی دلال یا ضعیفہ کی کھلی مٹھی بند نہ کرنی پڑتی تھی ۔ کسی قسم کی رکاوٹ حائل نہ رہنے کے سبب امینہ آزاد پرندہ تھی ۔ کبھی اس ڈال پر اور کبھی اُس ڈال پر اسکول جانے سے قبل وہ جس جگہ جانا چاہتی چلی جاتی تھی ـــــــ وہ خود مالک تھی اور اس زندگی کا حالیہ مقام اس نے خود حاصل کر لیا تھا ۔

میرا دل بھی اس محبوبہ حبل پورہ سے ملنے اور کلام کرنے کے لیے ضرور بے قرار ہوا ۔ یہ بے قراری وہی تھی جو ایک کہانی کا پلاٹ سامنے آنے سے ایک کہانی کار کے دل میں جاگ جاتی ہے میں خود حقیقی کہانیوں کا متلاشی ہوں ـــ جائے تعجب یا حسن اتفاق کہیے کہ اُدھر میرے دل میں خواہش اُبھری اُدھر امینہ سے

ملاقات ہوئی ۔

ایک شام پلاٹ والی تعمیر شدہ دکانوں کی سفیدی دیکھ کر واپس گھر آ رہا تھا کہ اومتی نالے کے بائیں بازو والی کھلی جگہ کے نکڑ پر ایک جوان عورت کا خفیف اور مبہم سایہ نظر پڑا ۔ قدم رک گئے ۔ اور میں جائے مخصوصہ کی جانب متوجہ ہوا ۔

"السلام علیکم" انداز سخن میری طرف تھا ۔

"آپ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کون ہیں —— میں آپ کو نہیں جانتا ۔" میں بوکھلا سا گیا ۔"

"میں تو آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں آپ ڈی او صاحب کے داماد ہیں ۔ کشمیر کے رہنے والے ——"

عورت ایک سانس میں سب کچھ کہتے قریب آتے لگی ——

میں اب اُسے

کچھ کچھ پہچان گیا تھا ۔ لحظہ بہ لحظہ خیال یقین میں بدلا سامنے امینہ تھی ۔ نزدیکی گلی میں کبھی کبھی کسی نہ کسی آدمی یا حیوان کے چلنے کی آواز آتی تھی ۔ اور میں ڈر کے مارے چونک گیا ۔ آس پاس کا جائزہ لیے دفعتاً میری نظر پرائمری اسکول کے بڑے گیٹ سے ٹکرائی —— جہاں بجلی کی روشنی میں شیام بابو سائیکل پر سوار ہونے کو تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا رُوم رُوم پسینے سے بھیگ گیا ۔ آس پاس کا جائزہ لیے میں آگے کی جانب بڑھنے ہی والا تھا ۔ ۔ ۔

کہ امینہ نے میری جانب ہاتھ دراز کیا ۔ موقع کی نزاکت کو پرکھتے ہوئے میں نے اپنی کھلی مٹھی اس کی جانب بڑھادی اور بند مٹھی واپس کھینچے پینٹ کی جیب میں بھر دی اور تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب بڑھنے لگا ۔

آٹا پیسنے والی مشین کے پاس جا کے نکڑ والے بجلی کے کھمبے کی روشنی میں اس کا دیا ہوا نامہ پڑھنے کے لیے جیب سے نکالا —— لکھا تھا ۔

"کشمیری بابو ——!

"میں نے بارہا آپ کو اس راستے سے آتے جاتے دیکھا ہے۔ اور نہ جانے کیوں پہلی ہی نظر دیکھنے سے دل میں آپ سے ملاقات کرنے کی چاہت جاگی۔ لیکن آپ سے مل نہ سکی اور جب میں نے آپ کو ٹاؤن ہال کے بینچ پر کتاب پڑھتے دیکھا اور بغور جائزہ لیا تو میری دبی ہوئی خواہش کو شہہ مل گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ آپ سے ضرور ملاقات کروں گی آپ کے پاس بیٹھوں اور باتیں کروں گی ـــــ

یقین جانیے! اس جبل پور میں میرا حقیقی درد جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنی کہانی سنانا چاہتی ہوں۔ اپنی پُر درد داستان حیات، حاجی صاحب کی بیٹی کبیرہ کی وساطت جان گئی ہوں کہ آپ کہانی کار ہیں۔ میں بھی ایک کہانی ہوں ـــــ ہاں ہاں میری ہستی بھی ایک افسانے سے کم نہیں ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ وکٹوریہ ہاسپٹل کے باہری گیٹ کے ساتھ والے باغیچے میں ملیں میں شام کے پانچ بجے کل وہاں آپ کا انتظار کروں گی۔ فکر نہ کریں۔ میں برقع پہن رکھوں گی۔ پنجابی کٹ کا - - - - - - ۔ اور میری سینڈل کا رنگ سبز ہوگا۔ شلوار ہوگی ـــــ ضرور آئیں اور مجھے کہانی یا داستان سنانے کا موقع بخشیں۔

منتظر دیدار

امینہ بیگم

تذبذب کی حالت میں گھبرایا ہوا میں گھر پہنچا ـــــ اور دماغی افراتفری میں غرق نہ جانے کیا کچھ الٹا سیدھا شریک حیات سے کہہ گیا - - - ۔ تو تو میں میں پر اتر آئی اور میں سیدھا اوپر والی بیٹھک میں جا کے اس ادھوری داستان کو کاغذ و قلم کے سپرد کرنے کی بابت شد و مد کے ساتھ سوچنے لگا ـــــ !!

دوسرے روز اتفاقاً علی الصبح اس ادھوری داستان کے داغدار ورقعے بیگم کے ہاتھ لگ گئے۔ ایک پلک میں کاغذوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، - - - - - -

میں ہکا بکا رہ گیا! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور غور کرنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
دل ہی دل میں اس محبت پر جو بیگم کو مجھ سے ہے دراصل بیگم ہماری آپسی محبت کے درمیان کسی ایک کی عارضی موجودگی تو درکنار کسی ایک کے تصور کو بھی برداشت نہیں کر سکتی ـــــــ کس قدر کرخت اور ٹھوس انداز کی محبت ہے اس کی ـــــــ! ویسے یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ حقیقی محبت کے پرستار اپنے انسیت و محبت سے لبریز سفر میں کسی ایک کی مداخلت برداشت نہیں کر پاتے۔

بیگم بھی مجھ کو حد سے زیادہ چاہتی ہے۔ اس کی چاہت نہ ختم ہونے والی ہے مجھے اس کا احساس ہے۔ لیکن اس طرح شک و شبہ سے کام لینا بھی اچھا نہیں ہے۔ بیگم کو کیسے سمجھاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ کہ دنیا داری اپنانے کے لیے انسان کو بہت وہ کچھ کر دکھانا پڑتا ہے جو ہو سکتا ہے محبت بھرا دل گوارہ نہ کر سکے۔ محبت غذا نہیں کہ کسی ایک کا پیٹ پال سکے۔ محبت نقدی بھی نہیں کہ کسی کی مشقت کا معاوضہ چکا سکے۔ محبت ایک اعلیٰ اور پاک جذبہ ہے جو اصل میں دو دلوں کے اندر کبھی بھی اور کسی بھی وقت پیدا ہوتا ہے۔ نہ ختم ہونے کے لیے! اس جذبے کو باہر کی کوئی تبدیلی، رنگینی اور دلچسپی قبضہ جمائے مٹا نہیں سکتی! محبت کا سوتا ایک بار پھوٹ پڑتا ہے۔ اور تادم حیات اس میں تفاوت نہیں آتا۔ خیر، لازوال، پر شفقت اور پاک محبت سے سرشار بیگم کی اس طرح کی کج ادائی بھی مجھے بھلی لگتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں اس سے شکایت بھی نہ کر سکا۔ نہ ٹوک سکا۔ــــ اتنے میں بہن زاہدہ ان بکھرے کاغذ کے پرزوں کو یکجا کر کے پن لگا کر میرے ہاتھ میں تھما گئی ۔ ۔ ۔ ۔ دفعتاً مجھے اس خط کا خیال ستانے لگا۔ جو جیب میں پڑا تھا۔ بیگم کی نظروں سے چھپانے کے لیے میں نے اسے اٹیچی میں رکھ دیا۔ اور مزید کچھ کہے سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔
اور پھر صحن میں آیا جہاں تختے پر بیٹھے ابا جان کی پر تکلف صحبت اپنائے

ان سے باتیں کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اباجان سے باتیں کرنے میں لطف سا آتا ہے، بحث مباحثہ میں وہ ایک سرغنہ کی حیثیت سے حصہ لیتے تھے اور ہر طرح کی محفلوں میں ان کی ذہانت کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ میں ان کی باتوں میں کھو جاتا تھا۔۔۔۔۔ جب وہ اور ان کی زندگی جوان تھی یقیناً اباجان بیک وقت ایک اچھے فلاسفر، مدبر، مقرر، صحافی اور ایک عام صوفی انسان تھے۔ غرض دن کا بہت سا حصہ ابا حضور کی صحبت میں کٹ گیا۔

امینہ سے ملنے کا اشتیاق دل میں کروٹیں لینے لگا اور بار بار امینہ کے رات والے خط کو پڑھنے لگا۔۔۔۔۔

ایک بجا ــــ

دو بج چکے ـــــــ

تین بجنے کو تھے کہ بیگم کی چھوٹی بہن عابدہ اور زبیدہ کی ضد اپنا اعلان کر گئی۔ انہیں میرے ساتھ سینما جانے کا شوق بہت زیادہ ہے۔۔۔۔۔ اس بار "چھوٹے نواب" کے چرچے انہوں نے سن رکھے تھے ـــــــ میں بہانے تراشنے لگا ـــــ

لیکن عابدہ بہن کے آگے کس ایک کی چلتی ہے ـــــ وہ تو بال کی کھال نکالنے والوں میں ٹھہری ـــــ ع

خدا دے زور ذہن اور زیادہ ـــــ!

بہن عابدہ کو خلوت میں لے جا کے اِدھر اُدھر کی سنا کے اور کل سینما لے جانے کا وعدہ کر کے میں نے چھٹکارہ پا لیا ـــ اور منتشر نگاہیں پھر سے کلائی پر پیسیان گھڑی پر جم گئیں۔ جس کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ امی جان کی برکت بھری صحبت اپنائے چار بج گئے۔ میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ امی جان نے چائے کا پیالہ میری جانب بڑھا دیا اور ۔۔۔۔۔۔ حسب معمول زاہدہ بہن رکابی میں دال موٹھ لے آئی ـــــ میں نے جلدی جلدی چائے پی لی اور کپڑے

تبدیل کرنے کی غرض سے بڑے ہال میں گھس گیا۔

"کہاں جانے کی تیاری ہے بھائی صاحب؟" زبیدہ باورچی خانے سے پکار اُٹھی۔

"تم لوگوں کو علم نہیں کہ ٹاؤن ہال میں فیملی پلیننگ کی نسبت نمائش لگی ہے اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔" میرے جواب میں کسی ایک کی زبان نہ کھلی اور میرا اُترا اُترا چہرہ دیکھ کر امی جان گلوری منہ میں دبائے مخاطب ہوئیں۔

"بیٹا جاؤ ——— وقت کٹ جائے گا۔ پر ۔۔۔۔ جلدی واپس آجانا ——— ابا جان تمہارے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے۔"

"بجا امّی جان ———!" زبان اپنا کام کر گئی ——— اور میں قدم آگے بڑھانے لگا ———

اب میں تھا ——— اور امینہ کا تصوّر ——— اور اس خط کا نفس مضمون ———

ٹاؤن ہال کے باغ میں سے گزر کر وکٹوریہ ہسپتال کے بڑے گیٹ پر نظریں جما دیں۔ جائے مخصوص پر کوئی خاتون نہ تھی۔ میں نے پھر بھی از راہ تسلی اندر جا کے باغیچے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن بے سود ——— واپس چلنے کا ارادہ باندھا ہی تھا کہ برقع پوش خاتون کا سایہ بڑے گیٹ کے پاس رینگنے لگا۔ اور وہ خاتون امینہ کے سوائے کوئی اور نہ تھی ——— نقاب میں ہی اس نے سلام بجا لایا۔ اور میں نے دل ہی دل میں جواب دیتے ہوئے پاس والے رکشہ والے کو بلایا۔

رکشے میں بیٹھ کر میں نے ہوٹل چلنے کے لیے کہا۔

"کون سا ہوٹل صاحب؟" رکشہ والے نے پوچھا۔

میرے اوپر پہاڑ ٹوٹ پڑا کچھ جواب نہ بن پڑا ——— آخر ذہن پر زور دیتے ہوئے کہہ گیا۔

"اسٹینڈرڈ ہوٹل لے چلو۔"

"نہیں ـــــ کنگز گارڈن چلیں گے ـ"، امینہ کی زبان بروقت کام کرگئی۔

"ہاں ـــــ رکشہ والے ـ" میں نے جلدی سے امینہ کی تائید کردی ـ

رکشہ والا فراٹے بھرتا ہوا گھنٹہ گھر کی طرف چل پڑا ـ

میری حالت غیر تھی ـ پتھر کی مورت کی طرح دم بخود رکشے میں بیٹھے رہا ـ کہ کہیں کسی واقف کار کی نظر مجھ پر نہ پڑے ـــــ کبھی کبھار امینہ کی جانب دیکھتا جو برقعے کا بایاں بازو وا کیے مجھے دیکھنے میں محو تھی ـ

کتنی آزاد طبعی اس میں سما گئی تھی، میں حیران تھا کہ امینہ نے شرم و حیاء کی دولت کہاں لٹا دی ہے ـ سچ ہے جب کوئی قتل کرتا ہے تو قتل کرنے سے پہلے اپنے ضمیر کو مارتا ہے تاکہ بعد میں اندر کا انسان اس کو سچ کہنے یا اپنے کیے پر پچھتانے کے لیے مجبور نہ کرے ـ اسی طرح ایک فاحشہ اور بدچلن عورت اس کثیف اور غلیظ نگری میں قدم رکھنے سے قبل اپنی شرم و حیا کا پیرہن اپنے ہاتھوں سے تار تار کرکے جلا دیتی ہے اور اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیتی ہے، امینہ نے بھی یہی کچھ کیا ہوگا ـ جب ہی وہ اتنی بے باکی دکھا رہی ہے ـ

ریلوے روڈ ـــــ ایمپائر سینما سے گزرتے ہوئے صدر بازار کے درمیان رکشہ رکا اور بائیں ہاتھ کی جانب کنگز گارڈن کا وسیع احاطہ دکھائی پڑا ـــــ سرسبز باغ ـ ـ ـ ـ درختوں سے لدے بھرے باغ کی ساخت اور آراستگی دیکھتے ہی وادی کشمیر کے شالیمار باغ کا ایک طبقہ میرے ذہن کے وسعتوں میں ابھر پڑا ـ لیکن کمی آبشاروں کی تھی ـ اور پہاڑی سماں کی ـ حالانکہ اس سے پہلے میں صابر میاں کے ساتھ اس باغ کو دیکھ چکا تھا ـ لیکن ماہ جولائی کی زبردست گرمی کے سبب واضح انداز میں باغ کا جائزہ نہ لے سکا تھا ـ

باغ کی کیاریاں سلیقے اور طریقے سے بنا دی گئی ہیں ـ جگہ جگہ انگریزی حروف زمین کرید کے بیل بوٹوں کی شکل میں نمایاں ہیں ـ جا بجا بیٹھنے کے لیے آرام دہ بینچ و کرسیاں لگی ہوئی ہیں اور درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ سایہ کیے ہوئے تھے

برقعہ کا اگلا پٹ پیچھے کیے امینہ بیٹھ گئی ——— اور تب امینہ کو میں واضح انداز میں دیکھنے لگا۔ اس کی صورت کو جس کو سنوارنے میں بناو سنگار کو زیادہ دخل تھا۔ باغ کا جائزہ لے کر امینہ نے ایک گوشے کی جانب اشارہ کیا اور میں نے حامی بھر دی۔

ہم اپنی جگہ سے اُٹھے۔ اس طرف خلوت کدہ سا تھا۔ وہاں ہم ایک چھوٹے سے بینچ پر تسلط جما گئے۔ اور سلسلہ کلام شروع کرنے میں امینہ نے پہل کی۔

"آپ کو کبھی پہلے بھی اس باغ میں آنے کا اتفاق ہوا ہے ——؟"

"آیا تو تھا، لیکن شدّت گرمی کے سبب سرسری جائزہ لیا تھا۔"

"یہ فرنگیوں کے دورِ حکومت کا سب سے خوب صورت اور عالی شان باغ مانا جاتا ہے ——" امینہ بے تکلف کہنے لگی۔ "سنا ہے پہلے عام لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ بلکہ راجے۔ مہاراجے اور انگریز آفیسر لوگ ہی یہاں سیر سپاٹے کے لیے آتے تھے۔ اور لطف اندوز ہوتے تھے ——— ———۔ اور وہ ———۔ اس کونے میں کلب کی عمارت ہے، اسی کے ساتھ ریڈنگ روم بھی ہے۔"

"یہ باغ تعمیر، کب اور کس کے دورِ حکومت میں ہوا ہے ——؟" میری کھوج لگانے کی لگن جاگ اُٹھی۔

"اتنا تو یاد نہیں ——— میں بھی تو نئی نئی جبل پور میں بسی ہوں بابو! کچھ سالوں کی رفاقت حاصل ہے۔"

امینہ اتنا کہہ کر سرد آہ بھرنے لگی۔

"آپ کا اصلی وطن کونسا ہے پھر ——؟" میں بے تامّل کہہ گیا۔

"اصلی وطن ——؟ میں بہار کی رہنے والی ہوں۔ ۱۹۴۷ء کے پُر درد و ہوس ناک دور نے مجھ سے میرے والدین کو چھین لیا اور سدا کے لیے میری بڑی بہن نعیمہ کو انسانیت و شرافت کے لٹیرے مالِ غنیمت سمجھ کے لیے اڑے۔ میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ نو دس سال کی بچی کیا کرتی ——— میں اپنی بدبختی پر تھپڑ مار مار کر روتی رہی

——— میری کسی ایک نے اعانت نہ کی۔ نہ کسی کا امدادی ہاتھ میری جانب بڑھا۔ ہر سو حیوانیت سوز مظاہرے، انسانیت شکن بلوے اور دنگے فساد دیکھنے کو ملتے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر ماری ماری پھرنے لگی۔ کوئی غمگسار نہ ملا۔ فقط میں تھی اور میری بے کسی کیوں کر اس انقلاب دہر کا مقابلہ کرتی۔ آس پاس کے حالات دیکھنے پرکھنے میں نے ندی میں ڈوب مرنا چاہا بابوجی ——— لیکن دنیا کے مالک کو میرا مرنا بھی منظور نہ تھا۔ عین ندی میں کودتے پر کسی شخص کا بھاری ہاتھ کاندھے پر پڑا۔ ہوش سنبھالنے پر میں نے دیکھا ایک بزرگ (ریش دراز) میرے سر کو اپنے زانوں پر رکھے پنکھا جھول رہا تھا۔

"بابا! مجھے مرنے کیوں نہ دیا —؟ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں بابا ——!"

"بیٹی! جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ نا اُمید مت ہو جاؤ بیٹی۔!"

دلاسہ دیتے ہوئے وہ بزرگ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ٹرین میں بٹھا کے جبل پور پہنچا دیا۔

صمد چاچا مجھے بہت چاہتے تھے بعد میں مجھے انہوں نے بتایا کہ ان کی بھی ایک بیٹی تھی رضیہ، جو اسی طوفان کی نذر ہو گئی تھی - - - -

کہتے کہتے امینہ رک گئی اور اس کے چہرے پر یاسیت کی سیاہی چھانے لگی۔ اتنے میں سوڈے شربت والا سامنے سے گزرا۔ میں نے شربت کے دو گلاس کا آرڈر دے دیا۔ اور شربت پینے کے بعد امینہ سے کہا۔

"امینہ! تم چپ کیوں ہو گئیں کہتے کہتے"! ——— "ساری کہانی گوش گزار کرنے کے لیے ہی تو آپ کو یہاں لائی ہوں ——— یوں ہی ذرا سا چکر آ گیا تھا۔ ہاں تو سُن لیجیے

صمد چاچا پاس والی مسجد میں امامت کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ اور مجھے مقامی لڑکیوں کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی خاطر داخل کرا دیا مولوی

کی بیٹی کے نام سے میں سارے رانی تال میں مشہور ہو گئی ۔

میں پڑھتی گئی ـــــــ

اور بزرگ صمد چاچا اپنی بیٹی کی طرح مجھے دل و جان سے چاہنے لگے ـــــ میرے دل سے انہوں نے ماں باپ کی جدائی کا صدمہ مٹا دیا ۔ اب وہی میرے لیے میرے ماں باپ تھے ۔

وقت کا پرندہ پرواز کرنے لگا ـــــ اور فلکِ کج رفتار کو میری خوشی اور میرا یہ سہارا ایک آنکھ نہ بھایا اور ایک رات مجھ بدنصیب پر میری بدبختی پھر سے منڈلانے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ صمد چاچا بھی مجھے دغا دے گئے ۔ ادھر سے میں نے مڈل پاس کیا ہوا تھا اور اُدھر صمد چاچا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے پھر سے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے ۔ وفات پانے سے قبل انہوں نے مجھے پاس والی رحیمن موسی کے سپرد کیا تھا ۔ صمد چاچا کی نقدی بھی کچھ بچی تھی اور میں تعلیم پوری کرنے کی خاطر اسکول جاتی رہی ـــــ رحیمن موسی پہلے پہل میرا بڑا خیال رکھنے لگی ۔ اسکول سے واپس آنے پر رحیمن (جسے میں پیار سے موسی کہتی تھی ۔) اور اپنے لیے کھانا بنایا کرتی تھی ۔ اور پاس میں سلائی کتائی کا کام بھی سیکھنے لگی ۔ میں اکثر صمد چاچا کی یاد میں رویا کرتی تھی ۔ اور اپنی برگشتہ بختی پر بھی ۔ جس نے میرے ارمانوں کے چراغ کو ایک تیز ہوا کے جھونکے سے گل کر دیا تھا ۔

صمد چاچا کی پاکیزگی اور صالح پن میں سرشار زندگی کے چند اوصاف مجھے ملے تھے اور میں ان پر کاربند رہتی تھی ـــ

نہیں معلوم تھا کہ بڑھی موسی ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کے روپ میں ڈائن نکلے گی ۔ پہلے وہ میرے آنے جانے پر روکتی ٹوکتی رہی ۔ اور پھر اسکول جاتے پر ۔ میں نے اس کی باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا شوق پورا بر لایا اور کسی نہ کسی طرح سے دسویں کے امتحان میں بیٹھ گئی ۔

نتیجہ آنے تک فرصت ہی فرصت تھی ایک لمبی چھٹی ـــ اور

ان چھٹیوں کو میں کام کاج اور کچھ سہیلیوں کے ساتھ مل جل کر گزارتے کا پروگرام بنا گئی۔ دن گزرتے گئے۔ شدید گرمیاں ساتھ چھوڑ گئیں اور برسات کے موسم سے واسطہ پڑا۔

ایک روز محکمہ سپلائز کا آدمی راشن کارڈ لے کے نفری چیک کرتے آیا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی ــــ پھر وہ غالباً روز اپنے دوستوں کے ساتھ چکر کاٹنے لگا ــــ بابو! میں اس کی صورت سے ہی پہچان گئی تھی کہ وہ ایک بد طینت آدمی ہے۔ میں نے موسی سے اس کا ذکر کیا کر دیا کہ اس نے اس شخص کے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔

"بڑا شریف لڑکا ہے بیٹی ــــ! اور پھر اچھی جائیداد کا اکلوتا مالک ہے۔ آگے پیچھے اس کا کوئی نہیں ہے۔ بیٹی اس کے والد یحییٰ صاحب بہت آسودہ حال تھے اور بیٹا بھی کچھ کم نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہارا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں۔"

بابو ــــ! شادی کا نام سنتے ہی میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں اور سارے جسم میں طراوت کی لہر دوڑ گئی لیکن میں اس شخص کی نیت پر بھروسہ نہ کر سکی۔

"یہ ہیں مرحوم یحییٰ صاحب کے فرزند عبدالجبار صاحب ــــ جن کا ذکر میں نے تم سے کیا تھا اور یہ ہیں میری پوتی امینہ!"

آخر رحیمن موسی نے ہم دونوں کو آمنے سامنے کرنے میں کامیابی حاصل کر ہی لی۔ اور تعارف بھی کرا دیا۔

میں لاج اور شرم کے مارے اس سے آنکھیں بھی نہ ملا سکی۔

دوسرے کمرے میں جا کر شربت بنا کر لائی۔ اور جبار صاحب کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔

جاتے وقت میں نے دیکھا ــــ کہ جبار نامی شخص نے جیب سے دس روپیہ کے نوٹ نکال کر موسی کے ہاتھ میں تھما دیے۔

اور موسی رقم جیب میں رکھتے خوشی خوشی اندر آگئی ۔
میں نادان تھی، کچھ بھی نہ سمجھ سکی ۔

اب

جبار صاحب روز کسی نہ کسی بہانے آنے جانے لگے ـــــ اور مجھ سے باتیں بھی کرتے تھے ۔

" آخر یہ پردہ مجھ سے کیوں ہے امینہ ـــــ ؟"

" پردہ ہی تو ایک نعمت ہے، شادی سے پہلے اُٹھ گیا تو پھر شادی کس کام کی ـــــ ؟ پردہ مسلم لڑکی کے ناموس کی حفاظت ہے، جو کسی بھی باکرہ کے قدموں کو لڑکھڑانے نہیں دیتا جبار صاحب! ـــــ اور پھر سنت بھی ہے ۔"

ایک دن جبار صاحب اپنے ساتھ ایک اور دوست کو اچانک لائے میں سامنے آنے سے جھجک گئی ۔

" ارے موسی! امینہ کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باہر بھیجو ـــــ ! یہ میرے جگری دوست ہیں ارشاد ـــــ بھلا ان سے کیا پردہ ؟" جبار بڈھی رحیمن سے کہہ گیا۔
اور میں لجاجت کی پتلی سہمی سہمی ان کے سامنے آگئی ۔

اور پھر ـــــ

اس کے بعد بالوجی ـــــ اُس رات ـــــ وہ رات خوب اندھیری تھی ۔ میں اندر کمرے میں چارپائی پر سوئی تھی کہ کسی ایک کرخت ہاتھ کے لمس نے مجھے چونکا دیا ۔ میں نے چیخنا اور پکارنا چاہا ۔ لیکن آن واحد میں ایک قوی ہاتھ میرے منہ سے چسپاں ہو گیا ۔ اور میری آواز حلق میں ہی دب کر رہ گئی ۔

اس ذلیل نے مجھے ویشیا بنا دیا ۔ میرے گوہر گرانمایہ کو مجھ سے لوٹ لیا ۔ ۔ ۔ ۔ جس کی حفاظت میں آج تک دل و جان سے کرتی آئی تھی ۔ دلہن بننے کے سپنے ٹوٹ گئے ۔ ڈولی میں سوار ہونے کی تمنا دم توڑ گئی ۔ اور کسی ایک کا جیون ساتھی بننے کا اشتیاق بھسم ہو کر رہ گیا ۔

میرا خیال تھا جبار صاحب ہوں گے۔ چلنے پر اس ذلیل نے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو کے سگریٹ سلگانے کے لیے لائٹر روشن کیا اور میں اس کمینے کی صورت پہچان گئی۔ یہ جبار نہیں ارشاد تھا جسے جبار نے اپنے جگری دوست کے لباس میں میرے سامنے پیش کر دیا تھا۔

برآمدے میں جاکر اس کمینے نے بڈھی کی مٹھی گرم کر دی۔

مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ میں تڑپی، روئی اور چلائی۔ پھوٹ پھوٹ کر بابو اپنی بدبختی پر ماتم کیا۔

مجھے وہ جھونپڑا ایک چکلہ خانہ لگا اور بڈھی ایک نائکہ ــــــ میں تھرا اٹھی۔ بڈھی کے لیے میرے دل میں نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ کٹنی تو زہراب سے کم ثابت نہ ہوئی۔ اس جھونپڑے کی ہر چیز مجھے کاٹنے لگی۔

پو پھوٹنے پر جب کہ بڈھی گرندی یا زار سبزی وغیرہ خریدنے گئی تھی میں اپنا مزوری سامان باندھ کے بھاگ نکلی ــــــ اور اپنی ہم نوالہ سہیلی صفیہ کی مدد سے مجھے حاجی یوسف تارا کی اسٹیٹ میں سے ایک گھروندا کرائے پر مل گیا اور وہ بھی نئے محلے میں جہاں میں آئے دلوں مقیم ہوں۔

بابو جی! اس گھروندے میں قیام کرنے پر میرا نتیجہ آؤٹ ہوا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لائی ــــــ جب کہ اپنا نام کامیاب طلبا کی فہرست میں پالیا۔

اب زندگی سنوارنے کی لگن مجھ میں پھر سے جاگ گئی اور میں نے پیٹ کی آگ بجھانے و زندگی بسر کرنے کے لیے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔

میں نے ہر ایک کے سامنے اپنی روئیداد سنائی۔ لیکن ہر ایک نے میرے کہے کو افسانہ سمجھ لیا۔ اور میری اعانت یا مدد کرنے کی خواہش کسی ایک نے ظاہر نہ کی۔ ماسوائے کمینے جبار کے۔ جس نے میرا اتا پتہ لگا لیا تھا اور میں جان گئی تھی کہ وہ کمینہ محکمہ سپلائز میں کام نہیں کرتا۔ بلکہ آوارہ گردی میں اپنے باپ دادا کی جائداد لٹا رہا ہے۔ میں اس کمینے کو خاطر میں نہ لائی اور کوشش برابر جاری رکھی۔

ہسپتال میں نرس بننے کی کوشش کی لیکن کسی ایک کا دل نہ پسیجا، سب کی نظریں میری جوانی پر لگی تھیں ـــــ میں نے دیکھا سب کے سب میرے جذبات سے کھیلنے کی نیت سے مجھ سے مصنوعی ہمدردی جتاتے تھے۔ میرے سینے کے اُبھاروں پر سب کی نظریں تھم جاتی تھیں اور میری بے بسی و لاچارگی کا فائدہ اُٹھانے کی بابت سب سوچتے تھے۔

افسوس بابو! انسان کتنا بدل گیا ـــــ بس تن واحد کی پرواہ کسی ایک نے نہ کی۔ اور کسی ایک جانب سے بھی ہمدرد بھائی اور باپ کا ہاتھ میری جانب نہ بڑھا۔ تھک ہار کر میں حاجی صاحب سے ملنے گئی۔ کتنے نیک خصلت انسان ہیں، انہوں نے مجھ سے درخواست لکھوا کرلی۔ اور میرا سرٹیفکیٹ ساتھ لیے انہوں نے کچھ دنوں بعد مجھے سرکاری پرزہ لاکر دیا۔ یہ آرڈر تھا میری تعیناتی کا۔ میرا تقرر بحیثیت استانی ایک مقامی پرائمری اسکول میں ہوا تھا۔ میں خوشی سے پھولے نہ سمائی ـــــــ مگر

پھر بھی ارشاد جیسے کمینے اور جبار جیسے ذلیل لوگوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا، وہ میری بے کسی سے فائدہ اُٹھانے کی فکر میں تھے اور ایک شام پکچر سے واپسی پر ان ذلیلوں نے مجھے اپنے قوی بازوؤں میں دبوچ لیا اور اپنی ویگن میں سوار کر دیا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ ویگن رکی اور یہ لوگ مجھے کسی ویرانے میں لے آئے تھے۔

میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے منتیں کیں ـــــ گڑگڑایا ـــــ لیکن وہ شیطان صفت انسان ٹس سے مس نہ ہوئے اور میری عزت کے ساتھ بے دردی سے کھیلنا شروع کر دیا ـ ـ ـ ـ ـ مجھے ان لوگوں نے انسان نہ رہنے دیا۔ میری اُمنگوں، اُمیدوں اور آشاؤں کا خون کرنا انہوں نے اپنا فرض جان لیا۔

"بابو جی! ایک بات کہوں، برا تو نہ مانیں گے ـــــ؟ ـ ـ ـ ـ یہ دنیا مردوں کی ہے ـ ـ ـ۔ اس دنیا میں مردوں کا راج ہے۔ اس دنیا میں مرد لوگ عورت کی بے بسی اور بے کسی سے کھیلنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں ـــــ

میں کیوں کر بیان کروں کہ قدم قدم پر مجھ بے کس کو لوٹا گیا۔ میرا ہاتھ کسی ایک نے نہ تھاما۔ بالائے ستم یہ کہ حاجی صاحب کو بھی میری بابت اِس اُس طرح کا کہہ کے بدظن کیا گیا۔ ان کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ اور میں پوری طرح سے اس حیوانیت کے نرغے میں پھنس گئی! جہاں کسی ایک مرد کی بیوی نہیں ہوتی بہن نہیں ہوتی —— اور سب سے بڑی بات ماں نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ پتھر سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ بابوجی ہر چیز کی حد ہوتی ہے - - - - - - میری زندگی جب ذلت کے کیچڑ میں لت پت ہو چکی اور یہ زندگی حد اعتدال سے گزر چکی تو میرے اندر کی عورت جاگ گئی۔ وہ عورت نہ تھی بلکہ زمانے کا کلنک تھی۔ اب میں امینہ بیگم سے امینہ بائی بن گئی ہوں۔ مردوں کے سروں کو جھکانے اور ان کے غرور کو توڑنے کے لیے میں نے وہی روپ دھار لیا جس کی انھیں تمنا تھی —— انہیں لوٹتی ہوں۔ رسوا کرتی ہوں اور جیب خالی ہونے پر دودھ کی مکھی کی طرح جدا کر کے ٹھکراتی ہوں۔

مجھے بدلہ لینا ہے مردوں سے، اس سماج سے جس کی بنیادیں مردوں کی مرضی سے کھڑی کر دی گئی ہیں۔ جس کی دیواریں مردوں کی صلاح سے تعمیر کی گئی ہیں۔ —— مجھے ان بنیادوں اور دیواروں کو پاش پاش کر دینا ہے۔ میں اس سماج کی دھجیاں اُڑانا چاہتی ہوں —— جس میں عورت کو فالتو جنس سمجھا جاتا ہے اور عورت کی مجبوری کو دل بہلانے کا آلہ سمجھا جاتا ہے۔

بابوجی ——! اس مردوں کے سماج میں کتنا سفلہ پن چھپا ہوا ہے...

- - -! پہلے میں نے ان سے مدد مانگی ان کے آگے پاک سہارے کے لیے ہاتھ پھیلایا مگر ان مردوں نے میری ایک نہ مانی۔ بلکہ میرے انمول ہیرے کو مجھ سے چھین لیا اور مجھے عورت کے پاک درجے سے گرا کر چوراہے کی ہانڈی بنا کر رکھ دیا۔ یہی مرد لوگ ہیں جنہوں نے مجھے ویشیا بننے پر مجبور کر دیا اور ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک کوٹھے کی زینت بنا دیا —— اور آج یہی مرد میری بدنامی کرتے ہیں اور مجھ سے اپنی اولاد کو دور دور رکھتے ہیں۔ - - -! کتنا وحشیانہ پن ہے یہ —— اور

کتنا انصاف کے برعکس !

آج نفرت اور تذلیل و تضحیک کی نظریں مجھ پر جمانے والے مردوں سے میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ کون ہیں جنہوں نے مجھے زندگی کے اس تاریک دور سے وابستہ کر دیا۔ ؟

کون ہیں جنہوں نے میری جوان اُمنگوں کے ساتھ کھیل کر مجھے حیوانیت کی چوکھٹ پر لا کھڑا کر دیا۔ ؟

میری جانب انگلی اُٹھانے والے اور مجھے بدنام کرنے والے مردوں سے میں سوال کرنا چاہتی ہوں کہ اگر کل کو ایک اور انقلاب بپا ہوا۔ اور میرے والدین کی طرح وہ اپنی اولادوں کا ساتھ چھوڑ گئے تو ان کی لڑکیاں کیا کریں گی کس کا دامن تھامیں گی۔ اور کیسے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کر سکیں گی۔ ؟؟

بابو جی !" اب کی بار امینہ کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ "میں سچ کہتی ہوں جو مرد دن کے اُجالے میں میرے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں میری مجلس میں شامل ہونا اپنی شان سمجھتے ہیں۔

مرد کے دو روپ میں نے دیکھے ہیں اور یہ دونوں روپ بدلتے رہتے ہیں۔ میں کیوں کر بتاؤں بابو جی ! کہ مجھے کس انداز سے رسوا کیا جا رہا ہے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ مجھے طوائف بننے پر کس نے مجبور کیا ؟

یقیناً انہوں نے جو میرے نام سے ڈرتے ہیں، میرے سائے سے کتراتے ہیں۔۔۔۔ جنہوں نے آج میرے لیے گھروں کے دروازے بند کر دیے ہیں اور جو طعنے کستے ہیں۔

بابو جی ! مجھے زندگی بھر یہ افسوس رہے گا کہ مجھ بے کس کی کسی ایک نے یاوری نہ کی۔ ان سماج کے ٹھیکیداروں نے مجھے ہر طرح سے ذلیل کیا اور آج جب کہ ان کے بتائے گئے راستے پر میں چل رہی ہوں تو مجھے جا بجا بدنام کیا جا رہا ہے۔

بس یہ ہے بابو جی میری المناک اور گھناونی کہانی۔،،

اتنا کچھ کہنے کے بعد امینہ زار زار رونے لگی۔ اس کی حالت ابتر ہو چلی تھی۔

یہ دردناک والمناک داستان سن کر میرا دل بھی بھر آیا اور آنکھیں تر ہو گئیں۔

" امینہ ـــــ تمہاری کہانی واقعی بہت دردناک ہے۔ کچھ مردوں نے واقعی تمہارے ساتھ بہت زیادتی اپنائی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ سب کے سب مرد بُرے ہوتے ہیں۔ اُن میں ہمدردی اور اخوت کا مادہ نہیں ہوتا۔

تم اب بھی شریعت وشرعی نظام کی پابند زندگی گزار سکتی ہو۔ اور گزرے واقعات کا کفارہ ادا کر سکتی ہو۔"

میں نے اسے دلاسہ دینا چاہا۔

" بابوجی ـــــ! آپ کو میری حالت پر رحم آیا ہے۔ آپ مجھے اس دَلدل سے نکالنا چاہتے ہیں۔ آپ ایک امینہ کو راہ راست پر لائیں گے، تو کیا مجھ ایک اَبلہ لنے سے یہ سماج، یہ نظام اور یہ مردوں کا دستورالعمل بدل سکتا ہے جس کا شکار روزانہ سینکڑوں اور ہزاروں لڑکیاں ہوتی ہیں۔

اور پھر ان ہزاروں امیناؤں کا کیا ہوگا، جو میری طرح بے نام زندگی گزارنے پر مجبور ہیں ـــــ یہ ایک امینہ کا مسئلہ نہیں ہے بابوجی! سارے سماج کا، ملک کا اور ساری دنیا کا ہے۔

بابوجی! میری حیثیت ایک اندھے کنویں کی سی ہے۔ اس میں جھانکنے ـــــ کھنگالنے سے ماسوائے پشیمانی اور پریشانی کے کچھ ہاتھ لگنے والا نہیں۔"

امینہ باتوں باتوں میں بہت کچھ کہہ گئی تھی میں اس کے خیالات میں غرق ہوا ـــــ دفعتاً میرے سامنے ہزاروں ولاکھوں امینائیں برقع پوش کھڑی ہو گئیں۔ اور وہ یاسیت کی تصویر بنے مجھ سے جینے کا حق مانگ رہی تھیں جن کی آنکھیں نم تھیں اور ہونٹوں پر ان کے نہ جانے کتنی تمنائیں وفریادیں دم توڑ بیٹھی تھیں۔۔

--- دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں اور لاکھوں قوی وکرخت ہاتھ ہوا میں لہرائے۔

اور آن کی آن میں بر قعے نوچے گئے۔ کپڑے تن سے اتارے گئے اور اب صرف برہنہ تن مورتیاں میرے سامنے تھیں اور مردوں کا نہ ختم ہونے والا ریلا ــــ یعنی کہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ۔

"تم درست کہہ رہی ہو امینہ ــــ یہ سچ ہے کہ اس دنیائے آب وگل میں انسانیت و شرافت کا ہر پہلو شیطان تمام مردوں کی ناپاک حرکتوں کا ہدف بنا ہوا ہے۔ اس دنیا میں عزت، ناموس اور عصمت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ انسانیت ومسرت کا گلا گھونٹے انسان نے زمرۂ حیوانیت میں قدم رکھے اپنی قدروں اور منازل کو فراموش کر دیا ہے۔

"امینہ ! دراصل یہ دنیا، انسانوں کا مسکن نہیں ہے۔ بلکہ حیوانوں کا اڈہ ہے اس دنیا میں رہ کر انسانیت کی بقا کی اُمید رکھنا فضول ہے"

اتنا کہہ کر میں نے امینہ کی جانب دیکھا وہ غائب تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا وہ نظر نہ آئی ــــ

تذبذب کی حالت میں بینچ پر سے اُٹھا ــــــ خفیف اندھیرا ہر سو چھانے لگا تھا۔ شام کے تاریک حلقے باغ کی وسعتوں میں پھیلنے لگے تھے۔ امینہ چلی گئی تھی ۔ اتنے میں بینچ پر پڑے کاغذ پر میری نظریں جم گئیں ۔

جلدی جلدی سامنے کھمبے کی روشنی میں پڑھنے لگا ۔

"بابو جی ! آپ نے میری داد رسی تن دہی کے ساتھ سُنی ! اس کا بہت بہت شکریہ ــــ

آج میں بہت خوش ہوں، آج آپ سے باتیں کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا ہے خدائے برحق آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین ۔

میری خاطر آپ کی آنکھوں میں آنسو آئے ۔ ان آنسوؤں کی قیمت میں کیا ادا کروں گی ۔ البتہ آپ کو سدا یاد رکھونگی کہ دنیا میں ابھی کچھ ہستیاں ایسی بھی موجود ہیں جن کے دل انسانیت کا خون ہوتے دیکھ کر تڑپ اُٹھتے ہیں ۔ اور جو اس

سماج وسوسائٹی کو پاک وصاف رکھنے کی تمنا میں تگ ودو سے کام لیتے ہیں!
خداوند تعالیٰ آپ کو ہر مرحلے میں کامیابی عطا کرے۔

آپ کی تابعدار

امینہ ــــ"

امینہ کا خط پڑھ کر مرے مرے قدموں کے ساتھ دل افسردہ باغ سے باہر آیا اور رکشہ کر کے گھر کی جانب چل پڑا ــ
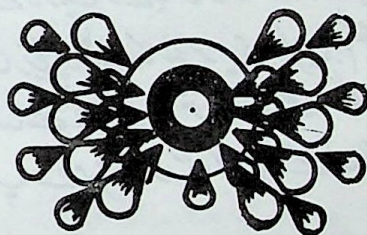
بدلہ

شریکِ حیات کی دائمی جدائی کے بعد رمضان کو لاتعداد مشکلات
کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے لیکن حوصلے کا دامن
ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور مردانہ وار غیر مناسب حالات کا مقابلہ کرتا گیا۔

اکلوتے بیٹے پرویز کی پرورش اور اسے اچھی تعلیم دینے میں اُس نے
جان توڑ محنت کی۔ ویسے مرحومہ کی طرح کشیدہ کاری اور کپڑے سینے میں رمضان
کو بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ پرویز کو ہی روشن مستقبل کی ضمانت سمجھنے لگا۔
پھر پرویز کی بشاشت اور خوشی کی خاطر رمضان نے
دوسری شادی کی نسبت سوچنا بھی گناہ جان لیا۔

وقت گزرتا گیا۔ کئی بہاریں آئیں اور اجڑ گئیں۔ اس روز جب کہ پرویز

نے سول انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کرلی تو رمضان نے اڑوس پڑوس میں لڈو بانٹے ———— جب پرویز نے پہلی تنخواہ باپ کے ہاتھ میں تھمائی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا اور نذر و نیاز میں رقم کا بڑا حصہ صرف کردیا ——— پھر پرویز کی شادی میں رمضان نے اپنا سارا جمع شدہ اثاثہ حتیٰ کہ مرحومہ کی آخری نشانی سلائی مشین تک داؤ پر لگادی۔

شادی کی تقریب دھوم دھام سے منائی گئی۔ چاند سی بہو رضیہ کو پانے کے بعد رمضان کا خیال تھا کہ اب اس کی باقی ماندہ زندگی آرام سے کٹ جائے گی۔ اُسے ہر طرح کا سکھ نصیب ہوگا۔ لیکن قسمت کو یہ منظور نہ تھا۔ ابھی پرویز اور رضیہ کی شادی کو مشکل سے تین ماہ ہی گزرے تھے کہ جان پہچان والوں نے دیکھا کہ پرویز شریک حیات کے ہمراہ عیش و عشرت کی راہ پر گامزن کلب کی وسعتوں میں کھو کر رہ گیا ہے اور لاغر جسم کے مالک رمضان اپنی بے بسی کا لبادہ اوڑھے تنگ گلی کے نکڑ پر تھوتھے چنار کی آڑ میں دست سوال دراز کیے بیٹھا ہے۔

اندھیرے کا ساتھی

نواب اصغر کے گلشن میں دو کلیوں اور ایک پھول کا اضافہ کیئے ناہیدہ بیگم کے خدوخال اب پھیکے پڑ گئے تھے۔ حکمین چہرے پر زردی اور جیتی جاگتی آنکھوں میں مردنگی سی سما گئی تھی نواب صاحب نے فرائض کی مورتیاں مسمار کیے بگڑے سانڈ کی طرح بیگم سے لاتعلقی اپنائی اور رسیلی بائی کو شریک حیات کا درجہ بخشے رنگین محل کی زینت بنا لیا۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے نواب صاحب کی رہی سہی چمک دمک، دولت اور توانائی رسیلی بائی کے چوکھٹ پر دم توڑ گئی اور اس نے حسب عادت نواب سے کنارہ کشی کیئے کسی دوسرے آشنا کو دام فریب میں پھانس لیا۔ ابتری و خصاصہ حالی کا ہدف بنے نواب صاحب کی کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی بصارت و کانوں کی سماعت جواب دینے لگی۔ دبدبہ جاتا رہا اور وہ تاریک ولق و دق صحرا میں بے ارادہ و بے مطلب اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔

دفعتاً اس گھپ اندھیرے میں نواب کے کمزور ہاتھوں کو کسی نے تھام لیا۔ اس کی لاغر و جھکی کمر کے گرد کسی نے بازو حائل کر دیے۔

دست اعانت دراز کرنے والی شخصیت ٹھکرائی ہوئی برسوں کی ساتھی ناہیدہ بیگم ہی تو تھی۔

داغدار

"یقین کر لو تم چاند کی طرح خوب صورت و دلکش ہو"۔

" چاند کا نام لے کر کیوں میرے حسن کی تضحیک کرنے پر اُتر آئے ہو خاص کر جب کہ یہ ثابت ہوا ہے کہ چاند کی حیثیت بے جان و داغدار بیاباں سے زیادہ کچھ نہیں۔"

" اچھا تو نازوں میں پروردہ کلی۔میں تمہاری ہستی کو چاند سے تشبیہہ نہ دوں گا۔مگر یہ کہنے دو کہ تمہاری مسحور کن خوب صورتی اور قوس قزح کی سی لچک کے مدمقابل چاند ستارے بجھے بجھے سے لگ رہے ہیں۔"

اپنی بابت تعریف کے کلمات سُن کے محبوبہ کا سراپا خوشی میں جھومنے لگا۔اُس کے مُنہ پر مسرت و انبساط کی چمک واضح انداز میں پھوٹ پڑی۔دفعتاً محبت میں سرشار وہ کٹی شاخ کی طرح محبوب کی گود میں گر گئی! بدلے میں محبوب چاند کی روشنی میں دودھیا وشفاف چہرے کو داغدار کرتے کرتے اس کے وجود کو رسوائی کی دہلیز پر لا کھڑا کر گیا۔

یہ سب دیکھ کر چاند ستارے کچھ وقت کے لیے بدلی کی چادر میں چھپ گئے۔

نمکُ حلالُ

سیٹھ دولت رام سرِ شام گھر لوٹ آئے اور حسبِ معمول شریکِ حیات کی شرکت میں اپنے سرد و کمزور جسم میں حرارت و جان ڈالنے کی غرض سے جام پر جام حلق پر انڈیلنے لگے۔

سنتے ہیں کہ سُنیتا نے پہلے پہل اس دلدل میں نہ گرنے اور اپنے کو بچانے کی ہر ممکن کوشش اپنائی۔ پتی دیو سے جھگڑا بھی کیا۔ لیکن سیٹھ جی نے ایک نہ سُنی، بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرانے کے لیے ملک سے باہر روانہ کرنے پر سیٹھ جی نے سنیتا کو اس کارِ نیک میں ہاتھ بٹانے کے لیے مجبور کر دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سنیتا کو ان تلخ مگر مستی بھرے قطرات کا عادی بننا پڑا۔ اب تو وہ اپنے پتی کا دل رکھنے کی خاطر خوب پیا کرتی تھی۔

لبالب جام باتوں باتوں میں خالی ہوتے گئے۔ کچھ دیر بعد سنیتا کی حالت حسب عادت دگرگوں ہو چلی۔ وہ اور اس کی ہوش مندی ایک ساتھ ڈگمگانے لگی اور دفعتاً وہیں مسہری پر ڈھیر ہو گئی۔

سیٹھ دولت رام کے ہوش و حواس اب بھی برقرار تھے۔ پتنی کو اسی حالت میں چھوڑ کر کار میں گھس اس نے لطیف چوک کا رخ کیا۔ جہاں بستی کی زینت "گُل بدن"، کو سجے سجائے برآمدے میں اپنا منتظر پایا۔

جب سے سیٹھ نے معقول رقم ہفتہ وار بھیجنی شروع کی تھی گلبدن کو ایرے غیرے کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

اُدھر سیٹھ جی گل بدن کے سڈول اور متوازن جسم کو اپنی باہوں کے حلقے میں بھینچے مسلنے لگا۔ اس کے زیر و بم میں اپنی دم توڑتی جوانی کے نقوش تلاش کرنے لگا۔

اور ادھر مسہری پر سے بی بی جی کے بے حس و بھاری جسم کو اُٹھائے سرجو شب باشی کے کمرے کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

اندھیرے کی چادر اوڑھے ساکت ہونٹوں پر اپنے گرم گرم لب پیوست کر کے گویا مردہ جسم میں روح پھونکنے لگا۔ سنیتا کسمساتے لگی اور پھر اپنے آپ کو سرجو کے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔

نہ جانے یہ کھیل کب سے جاری ہے اور کب تک جاری رہے گا۔ آخر سرجو نے مالک کا نمک کھایا ہے، گھر کی بات کو بازاری قصہ بنا دینا اس نے مناسب نہیں جانا۔
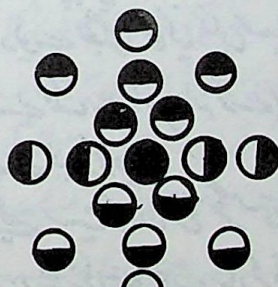
کارخانہ میں ہلچل مچ گئی۔ غریب مزدور منیرا مشین کی زد میں آگیا۔
سیٹھ صاحب خبر سن کر کچھ گھبرائے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ جلد ہی اپنی حالت
سنبھالتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا،

"کام جاری رکھو ــــــ منیرا کی موت اللہ پاک نے اسی طرح لکھی تھی۔
اس کے مرنے سے کارخانہ بند نہیں ہو سکتا۔"

مزدوروں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

منیرا کی لاش سامنے رکھی ہوئی تھی۔ خون بھری جواں لاش ــــــ
اس کے لب بند تھے۔ لیکن احتجاج سے لبریز نقوش اب بھی اس کے سرد ماتھے پر
نمایاں تھے۔ اس کی مسخ شدہ صورت سیٹھ اکرام اللہ سے چیخ چیخ کر التجا کر رہی تھی۔

"مجھے ایک ہفتے کی مزدوری پیشگی دے دو جناب ۔! صرف ایک ہفتے کی۔ جس کے بدلے میں دن رات کام کے لیے خون پسینہ ایک کردوں گا۔۔۔

۔۔۔۔ میرے بچے بھوکے رہیں گے۔ سیٹھ صاحب! میری بیوی کے جسم پر چیتھڑے لٹک رہے ہیں۔ اس کا پیٹ بھوک کی آگ سے جل رہا ہے۔ وہ بیمار ہے سیٹھ جی مجھے اس کا علاج کرانا ہے۔ میری حالت پر رحم کھاؤ ـــــ آپ کو اس دیوان خانہ کی منقش درو دیوار کا واسطہ جس کے تلے انسانیت روندھ گئی ہے۔ ہاں ہاں، اس فلک بوس عمارت کے نیچے ہم غریبوں کی مجبوریاں دب کر رہ گئی ہیں۔ اس کی بنیاد غریبوں کی قبروں پر ایستادہ ہے۔"

آن کی آن میں سیٹھ کے کارندوں نے منیرا کی لاش ہٹا دی۔ ساتھ میں مزدوروں نے ہڑتال کی دھمکی دی۔

"ابا جان ـــــ!" سیٹھ صاحب کے لڑکے امجد نے دیوان خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے؟" سیٹھ صاحب کی غصیلی آواز گونجی۔

"منیرا کے تکفین کا سامان ہمیں کو کرنا ہوگا ـــ" امجد نے سکون بھرے لہجے میں کہا۔

"تکفین کا سامان ـــ اور ہمیں ـــ وہ کیوں؟"

"ابا جان! منیرا غریب ہے اور اس کے گھر والے ـــــ"

"امجد!" سیٹھ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بے وقوف! مزدور تو مرتے ہی رہتے ہیں ـــــ میں نے ان کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اگر کچھ نہیں تو کہہ دو انہیں کہ منیرا کو جسم کے کپڑوں سمیت دفن کر دیں۔"

"مگر ـــ وہ تو پھٹے ہوئے اور خون میں لت پت ہیں ـــ"

امجد کی زبان میں عاجزی تھی۔

"نکل جاؤ یہاں سے نالائق ـــــ!" سیٹھ صاحب آپے سے

باہر ہو گئے ـــــــ

" ابا جان ! مرحوم منیرا کی ایک بیوہ ہے، ماں اور تین بچے ہیں ۔"

" مجھے سب معلوم ہے۔" سیٹھ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

" وہ سب دو دن سے بھوکے ہیں ۔ بیوہ بیمار ہے ۔ کچھ تو رحم کیجیے ۔"

امجد بھرپور انداز میں وکالت کرنے لگا۔

" تو میں کیا کروں ـــــــ ؟"

سیٹھ صاحب کا سفاکانہ لہجہ ابھر پڑا ۔

" آپ نے سرکاری کارندوں کے سامنے مان لیا تھا کہ مرحوم کے اہل و عیال کو ماہانہ پچاس روپے دوں گا، وہ تو دیجیے ۔"

" ارے پگلے کہنے کو کیا نہیں کہا جاتا ۔ وہ تو اپنی پوزیشن کا خیال رکھنے اور معاملہ کو رفع دفع کرنے کی غرض سے میں نے ویسے ہی کہا تھا ۔

" لیکن ابا جان ـــــــ ! میں یہ ظلم نہ ہونے دوں گا ۔ منیرا کے اہل و عیال کو ان کا حق دلانا میرا فرض بنتا ہے ۔ مرنے سے قبل منیرا نے میرے پاؤں پر سر رکھ کر التجا کی تھی ۔

" شٹ اپ ـــــــ " سیٹھ صاحب برس پڑے ۔

" نکل جاؤ یہاں سے، اور میری نظروں سے دور ہو جاؤ !"

" صرف یہاں سے ہی یا گھر سے بھی ؟" امجد کا احساس خودی جاگ اٹھا تھا

" چلے جاؤ جہنم میں ۔ میں ایک پائی بھی نہ دوں گا ـــــــ بڑا آیا غریبوں کی وکالت کرنے والا ـــــــ "

سیٹھ صاحب اتنا کہہ کر سامنے سہ پائی پر پڑی فائیلوں کی ورق گردانی کرنے لگا ـــــــ ان فائیلوں میں نہ جانے کتنے غریب و بے بس مزدوروں کی مسرتیں و خوشیاں دبی پڑی تھیں ۔

" میں جا رہا ہوں ابا جان ! ـــــــ "

سیٹھ صاحب کا نورِ چشم، اور اس گھرانے و خاندان کی واحد نشانی سادہ لباس میں ملبوس کہہ رہا تھا۔

"کہاں ——؟ سیٹھ صاحب نے سوالیہ انداز میں سر کو جھٹکا دے کر کہا ——

"ایک دکھی ماں کو اولاد کا پیار دینے" ایک بیوہ اور اس کے معصوم بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے"۔

"بے وقوف ——! کیوں جذبات میں آکر اُول فول بک رہے ہو۔ جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ ——"

"ابا جان ——! میں آپ کے گھر سے بھی نکل رہا ہوں اور دفتر سے بھی ——" اب کے امجد برجستہ کہہ گیا۔

"خدا حافظ ابا جان ——!" اور امجد دروازے سے باہر نکل آیا

سیٹھ صاحب کچھ بھی نہ کہہ سکے، پھٹی پھٹی نگاہوں سے امجد کو جاتے دیکھا اور پھر غیر ارادی طور پر بڑبڑایا۔

"اُونہہ —— نادان چھوکرے!! یہ کیوں نہیں کہتے کہ بیوہ میں دل چسپی ہے —— کوئی داشتہ ہوگی۔ اس لونڈیا کے پیچھے زندگی بھر کا آرام و آسائش ٹھکرا رہا ہے، ہونہہ ۔۔۔ کچھ دنوں بعد خود ہی ٹھوکریں کھا کر واپس آجائے گا ——"

ایک خط ایک کہانی

تمہارا حالیہ خط خودداریوں کے گیت گنگناتا آج سویرے موصول ہوا۔

آہ ــــ! میری حسرتوں کا تم احترام کرنا چاہتی ہو ــــ لیکن اس نسبت عملی اقدام اٹھا نہیں سکتی۔ میری آرزوؤں کا وقار تم کو منظور ہے، لیکن تحفظ وقار کی کوئی تدبیر تمہارے ذہن میں نہیں۔

میری اُمیدوں کو سسکتا دیکھ کر تمہارا دل دکھتا ہے۔ میری تمناؤں کا دم توڑنا تمہارے لیے سوہان روح سے کم نہیں۔ لیکن انہیں آبِ حیات پلانا تمہاری دسترس سے باہر ہے۔ اس لیے تمہیں سماج سے، سماج کے تقاضوں سے میری بھیک مانگنا منظور نہیں۔

کاش تم نے ترش و تلخ انداز میں یہ خط تحریر کرنے سے قبل میرے

دھڑکتے ہوئے دل کی دم توڑتی تمناؤں کا جائزہ لیا ہوتا ـــــ کاش تم نے دامن جھڑکنے سے پہلے حقیقت حال سے باخبر ہونے کی کوشش کی ہوتی۔

یقین کرلو، میں نے تمہیں اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ تمہاری زیست کا ہر شعبہ میری نظر میں ہے۔ لگ بھگ کوئی چار سال کا عرصہ ہم دونوں نے ایک ساتھ گزارا۔ اس عرصہ میں غالباً تم نے بھی میرا مطالعہ کرلیا ہوگا۔

سلمیٰ! یقین کرلو ـــــ یہ نظریہ پست ہمت، مردہ دل اور بے عمل قوتوں کا ہے کہ وہ حالت کو موافقت کے سانچے میں ڈالنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ قوتیں جن کے جذبات سو جاتے ہیں اور جن کی امنگیں پیدا ہونے سے قبل ہی فنا ہو جاتی ہیں ایسے ہی گیت گایا کرتی ہیں۔

تم جس قوم کی فرد ہو اس کے "حال" پر لاکھ جمود کی گھٹائیں مسلط سہی لیکن اس کے "ماضی" کی ستم ریزیاں اب بھی ان گھٹاؤں کو ہٹا سکتی ہیں۔۔۔ تم مایوس نہ ہو، تمہارا اور تمہاری قوم کا ماضی زندہ ہے، اور "مستقبل کو زندہ کرنا تمہارے امکان میں ہے۔ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے تمہارے پاس تمہاری شرافت، تمہارا علم اور تمہارا اخلاق حسنہ ایک مستقل سرمایہ ہے۔ جس کو کبھی زوال نہیں آسکتا۔ یہ نہ جان لینا کہ میرا معیار زندگی وجاہت طلب اور عشرت پسند ہو سکتا ہے۔ میں نہ تو سنہری ٹھیکریوں سے کھیلنے کو ہی زندگی سمجھتا ہوں اور نہ مرمر کے جیسے جانے کو ہی زیست مانتا ہوں۔ میرے نزدیک دو دلوں کا ایک ہو جانا ہی زندگی ہے۔ خواہ دنیاوی مسرتیں انہیں حاصل ہوں یا نہیں۔

سلمیٰ ـــــ اس سے بڑھ کر میری خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ تمہارے روبرو میری زندگی کے لمحات بسر ہوتے، میری آرزو کی دنیا بس جاتی! میری تمناؤں کی جنت مہکتی اور میری اُمیدوں کے خواب بیداریوں میں بدل جاتے۔

لیکن آہ: ظالم قسمت نے بے مائیگی کے تاریک و زمین دوز تہہ خانوں سے باوجود کوشش کے اُبھرنے نہ دیا۔ اقتصادی تفکرات کی آندھیاں

ایسی چلیں کہ میرے حسین تصورات کی تمام شمعوں کو بجھا کر رکھ دیا۔

اب تم ہی بتاؤ !

میں تمہیں اپنے قصرِ امید کی رانی کیوں کر بناؤں اور تمہارے والدین سے کس منہ سے تمہاری بھیک مانگ سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے والدین تمہاری سفارش کا احترام کریں۔ لیکن ـــــــــ آغوشِ نعم میں پلنے والی معصوم حسینہ ! میں کس دل سے تمہیں محل سے نکال کر جھونپڑی میں لا بساؤں پھولوں کی سیج سے اٹھا کر کانٹوں کی باڑ میں بٹھا دوں ـــــ ؟

یقین کر لو ـــــ تم چاند ہو تمہیں بساطِ فلک ہی کی ضرورت ہے فرشِ زمیں تمہارے لیے موزوں نہیں ۔

تم پھول ہو، اور شاخِ گل پر ہی شگفتہ رہ سکتی ہو۔ دامنِ گلچیں میں مرجھانے کا اندیشہ ہے۔

تم ـــــ شمع ہو ـــــ انجمن تمہاری ضیاباری کے لیے مناسب ہے۔ بیاباں میں گم ہو جانے کا خطرہ ہے۔

تمہیں اپنی تلخ و نامراد زندگی میں شریک کر کے میں تمہاری مسرتوں کا خون نہیں کر سکتا !

اس لیے یہی اچھا ہے کہ تم مجھے سدا کے لیے فراموش کر جاؤ میری یاد تک کو اپنے دل سے نکال دو۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی تو نہیں۔
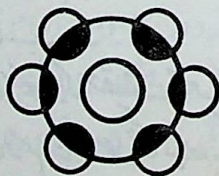
عورت ایک پہیلی

"ممتاز میری محبوبہ ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر فراموش نہیں کرسکتا۔" یوسف نے برجستہ کہا۔

"لیکن تم بخوبی جانتے ہو کہ ممتاز میری بیوی بننے والی ہے اور عنقریب ہی دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔" مظفر نے اپنا دعویٰ ایک بار پھر دہرایا۔

"ژاژ خائی ___"

"یہ بکواس نہیں بلکہ حقیقت جس کا تمہیں اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔"

"گو کہ منگنی کی رسم ادا کی جا چکی ہے۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ممتاز اب بھی میری ہے۔"

"یوسف ! تمہاری یہ ہٹ دھرمی ہماری برسوں کی دوستی اور اپنائیت کے نام پر تعمیر شدہ عمارت کو مسمار کر سکتی ہے۔" مظفر نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"ارے پگلے ! دولت کا سہارا لے کر تم نے ممتاز کے والدین کو دام فریب میں پھنسا لیا۔ اور منگنی رچائی —— لیکن یقین کر لو —— تم شادی کرنے کے باوجود ممتاز کی روح کو نہیں بلکہ اس کے جسم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو گے ممتاز کے ساتھ شادی کرنے میں بظاہر تمہیں کامیابی حاصل ہوگی۔ لیکن یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ممتاز کی روح کے ہر گوشے میں میری تصویر پنہاں ہوگی۔"

"یہ روح اور جسم کا معاملہ میں کیا جانوں —— ؟ میں تو فقط اتنا جانتا ہوں کہ ممتاز کے شوہر کے روپ میں مجھے اس کے جسم و جان کا مالک بننا نصیب ہوگا"

"بے وقوف انسان ! تم بظاہر ممتاز کے مالک ضرور کہلاؤ گے۔ لیکن اس کی روح کی گہرائیوں میں تم نہ اتر سکو گے کیونکہ آج تک تم یہی سمجھنے سے قاصر ہو کہ ایک محبوب اور شوہر میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

"اور شوہر کا رتبہ —— ؟" مظفر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سن لو مظفر —— ! محبوب کا انتخاب لڑکی اپنی پسند سے کرتی ہے۔ اور زندگی کی آخری ہچکی تک اسے فراموش نہیں کرتی۔ تم نے اس سچائی اور ٹھوس حقیقت کو جاننے کی کوشش نہیں کی نہ ہی تم نے اس اصلیت کو پرکھا ہے جو دنیا والوں کے لاکھ ظلم و ستم کے باوجود بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ تم ممتاز کے شوہر بن سکتے ہو —— ممتاز اپنی خوشی سے نہیں بلکہ اپنے والدین اور سماج کے بندھنوں سے مجبور ہو کر سرخ جوڑا پہن کر اپنے ارمانوں کا خون کر کے تمہاری دلہن بن جائے گی۔"

"میں اسے اتنا پیار دوں گا یوسف کہ اس کے سر سے محبت کا بھوت ایک ہی دن میں اتر جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ ممتاز تمہاری یاد تک کو بھی اپنے دل سے نکال پھینکے گی۔ اور مجھے دل و جان سے چاہنے لگے گی۔"

"یہ صرف تمہاری بھول ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا جب محبت کی

شمع کسی دل کے نہاں خانے میں ایک بار روشن ہو جاتی ہے تو وہ پھر مشکل سے ہی بجھ پاتی ہے۔ جب ایک بار پیار کی کونپل کسی کے دل میں پھوٹ پڑتی ہے تو روح کی انتہائی گہرائیوں تک اُترتی چلی جاتی ہے۔''

یوسف اپنی بات پر قائم رہا۔

تو۔۔۔تو۔۔۔میں۔۔۔میں کے بعد یوسف اور منظفر کچھ وقت کے لیے خاموشی اختیار کر گئے۔ اور پھر معاملہ کو طول نہ دیتے ہوئے دونوں دوستوں نے طے کیا کہ ممتاز سے رابطہ قائم کیا جائے۔ اور اصلیت دریافت کی جائے کہ وہ اپنے محبوب کا ہو کے رہنا چاہتی ہے یا اپنے منگیتر سے اپنی وابستگی کا اظہار کرے گی۔ تاکہ دونوں کی آپس کی برسہابرس کی پرانی دوستی شریک حیات کے انتخاب میں دم توڑنے سے بچ جائے۔

غرض دونوں دوست اسی وقت حاجی غلام قادر صاحب کی کوٹھی کی جانب چل پڑے۔

کوٹھی کے بیرونی گیٹ پران کے گھر کا ملازم رحمان منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ اداسی کی وجہ پوچھنے پراس نے بتایا کہ "ممتاز کل رات سے لاپتہ ہے۔'' وہ دونوں دوست حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے پھر اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے وہ دونوں تیزی سے کوٹھی کے اندر داخل ہو گئے۔

اندر جانے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ پوری کوٹھی میں موت کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ یہ دونوں قدم بڑھاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔۔۔۔

ڈرائنگ روم کے وسط میں بچھے ہوئے صوفے پر حاجی غلام قادر صاحب اپنا سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے۔ سامنے رکھی ہوئی میز پر کچھ کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کاغذ کا پرزہ حاجی غلام قادر صاحب نے اُٹھا کر اپنے ہونے والے داماد منظفر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

پریشانی کے عالم میں منظفر نے کاغذ کے پرزے کو کھول کر دیکھا۔

خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

" پیارے ابا جان!

میری خواہش معلوم کیے بغیر آپ نے مظفر کے ساتھ میرا رشتہ طے کر دیا۔ میں نے دبی زبان میں امی جان سے احتجاج بھی کیا۔ مگر آپ نے میری خواہشوں کو اس طرح پامال کر دیا جیسے میں انسان نہ ہو کر بھیڑ بکری ہوں کہ جس کھونٹے سے چاہا باندھ دیا۔

آپ نے میرے جذبات و احساسات کو یوں ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا۔ میرے جذبات سے کھیلنا گویا آپ نے اپنا فرض جان لیا۔ میرے ارمانوں کی نگری میں آپ نے آگ لگانے سے قطعی گریز نہیں کیا۔ میری قسمت کا فیصلہ کرتے وقت آپ شاید یہ بھول گئے کہ میں بالغ ہوں اور اپنی زندگی و مستقبل کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار کا پورا حق مجھے حاصل ہے۔ اس نسبت آپ نے غیر منصفانہ و جابرانہ رویہ اپنا کر مجھے بغاوت پر اکسا دیا۔ اس لیے آج مجبوراً میں اپنے من چاہے ساتھی رفیع احمد کے ساتھ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میں نے رفیع احمد کے ساتھ شادی کرنے کا اٹل فیصلہ کر لیا ہے۔

ابا جی ——— مجھے اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ میرے اس رویہ سے آپ کو بہت دکھ ہوگا اور آپ کی نیک نامی و شہرت کو بھی سخت دھکا لگے گا لیکن کیا کروں؟ "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق میں اپنی محبت اپنے پیار، اور اپنی زیست کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے نہیں گھونٹ

سکتی ـــــ اور پھر میں ہرگز ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ آپ کے لاڈلے اور نکمے مظفر کے ساتھ ساتھ اس کے من چلے دوست یوسف کا منحوس سایہ بھی میری زندگی کی راہوں پر پڑے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی وابستہ ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ میں کچھ کھا کر ابدی نیند سو جاؤں ـــــ!

پیارے ابا جان ـــــ مجھے اُمید ہے کہ میری اس گستاخانہ صاف گوئی کے لیے آپ مجھے معاف کریں گے۔

فقط معافی کی خواستگار آپ کی گستاخ بیٹی

ممتاز ـــــ"

خط کی تحریر پڑھنے کے بعد یوسف اور مظفر دونوں کے چہروں کے رنگ پیلے پڑ گئے اور حسرت و یاس کی تصویر بنے وہ دونوں ایک دوسرے کو تکنے لگے ـــــــــ!

خاص طور پر یوسف کا بہت بُرا حال تھا۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہ دونوں مرے مرے قدموں کے ساتھ کوٹھی سے باہر نکلے۔ ان کے لب پر شکوہ تھا نہ شکایت۔

" ساہو صاحب گو [illegible] کے مالک ہیں۔ اردو میں لکھنا ان کا پیشہ نہیں بلکہ شوق ہے۔ وہ کسی یونیورسٹی میں اُستاد [illegible] ہیں۔ بلکہ سرکاری ملازم تھے [illegible] محکمہ برقیات کے ایک اہم عہدے سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ آج کل وہ ایک بیباک اور نڈر [illegible] اخبار "[illegible]" کی عنانِ ادارت سنبھالے ہوئے ہیں۔ بحیثیت صحافی ان میں وہ سبھی خصو[illegible] ہیں جو [illegible] قابل تجربہ کار اور باوقار مدیر میں ہونی چاہئیں۔

ساہو صاحب ہر فن مولا ہیں۔ وہ ایک خاموش ادیب [illegible] کار کی [illegible] اچھے مقرر ہیں یہ معلوم کر کے مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ وہ ایک باصلاحیت [illegible] ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں۔ اس فن میں وہ چھپے رستم نکلے ہیں۔ اردو والوں کو ان کی افسانہ نگاری پر فخر کرنا چاہیے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے "بستی بستی صحرا صحرا" اور "پھول کا ماتم" میری نظر سے گذرے ہیں۔ اب تیسرا مجموعہ "اندھا کنواں" کا مسودہ پیش نظر ہے جو پریس میں جانے والا ہے۔ میں نے کچھ افسانے پڑھ ڈالے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مختصر افسانہ نگاری میں ساہو صاحب ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے مکالمے اور کردار ہم جیسے ہیں۔ یعنی ہمارے معاشرے کے افراد۔ ہر افسانے کا پلاٹ مربوط ہے۔ فنی خوبیوں کے لحاظ سے مکمل ہے۔ وہ روزمرہ، محاورے اور تشبیہوں کا صحیح اور موزوں استعمال کرتے ہیں۔ زبان شیریں، اسلوب بیان دلکش اور دلآویز۔ ایک کشمیری ہونے کے باوجود انہیں اردو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ "

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری
(سرینگر)